167

محدث

وَدَاعِیًا إِلَى اللهِ بِإِذْنِهِ
وَسِرَاجًا مُّنِیرًا

مجلس التحقیق الاسلامی

مدیر اعلیٰ
حافظ عبدالرحمن مدنی

ماہنامہ محدث لاہور

ماہنامہ 'محدث' لاہور کا اجمالی تعارُف

مُدیر اعلیٰ: حافظ عبدالرحمٰن مدنی **مُدیر:** ڈاکٹر حافظ حسن مدنی

ماہنامہ 'محدث' لاہور، ہندوستان سے نکلنے والے ایک رسالے کی ہی ارتقائی شکل ہے۔ جامعہ رحمانیہ دہلی سے نکلنے والے رسالے - جس کا نام محدث تھا- کو پروان چڑھاتے ہوئے تقسیمِ ہند کے بعد دوبارہ ماہنامہ 'محدث' لاہور کے نام سے پاکستان میں معروف عالم دین ودانشور حافظ عبدالرحمٰن مدنی حفظہ اللہ نے اس کا اِجراء کیا۔ یہ تحقیقی رسالہ ۱۹۷۰ء سے اب تک کامیابی وکامرانی سے شائع ہو رہا ہے، وللہ الحمد!

محدث کی علمی پہچان کے حوالے سے اتنا ہی کافی ہے کہ یہ ہر صاحبِ علم وفضل کی ضرورت بن چکا ہے کیونکہ اس کے مضامین جدید فکر کے حامل اور ملحدانہ افکار کیلئے شمشیر بے نیام کی حیثیت رکھتے ہیں۔

گھر بیٹھے 'محدث' وصول کیجئے!

قارئین کرام! گھر بیٹھے محدث حاصل کرنے کیلئے درج ذیل طریقہ کار اختیار کریں!

فی شمارہ: ۲۰روپے زرِ سالانہ: ۲۰۰روپے بیرون ملک: ۲۰ڈالر

بذریعہ منی آرڈر/بینک ڈرافٹ ۲۰۰روپے بھیج کر سال بھر گھر بیٹھے محدث وصول کریں اور علمی و تحقیقی مضامین سے استفادہ کریں۔ ایڈریس: ماہنامہ محدث، ۹۹ جے، ماڈل ٹاؤن، لاہور ۵۴۷۰۰

فون نمبر: 042 - 3586639 / 35866476 موبائل: 0305 - 4600861

انٹرنیٹ پر محدث پڑھنے اور ڈاؤن لوڈ کرنے کیلئے درج ذیل ویب سائٹ دیکھئے!

www.mohaddis.com __ www.kitabosunnat.com

مزید تفصیلات کیلئے: webmaster@kitabosunnat.com

اجرائے مُحدث کے مقاصد

☜ عناد اور تعصّب قوم کیلئے زہر ہلاہل کی حیثیت رکھتے ہیں!

لیکن تعصّبات سے بالاتر رہ کر افہام و تفہیم اُمت کیلئے رحمت کا باعث ہے۔

☜ علومِ جدیدہ سے ناواقفیت اور انکار، انسانی ارتقاء کو تسلیم کرنے میں بخل کا درجہ رکھتے ہیں!

لیکن قدیم علومِ اسلامیہ کو فرسودہ قرار دینا اور مذہبی روایات کے حاملین کو دَقیانوس بتانا اُمت کی تباہی کا سبب ہے۔

☜ غیر مذاہب کے بارے میں معاندانہ رویہ اختیار کرنا اسلامی اَقدار کے منافی ہے!

لیکن دینِ اسلام پر غیر مذاہب کے حملوں کا دفاع نہ کرنا اور اسلام کی تبلیغ کا فریضہ سرانجام نہ دینا حمیت دینی اور غیرتِ اسلامی سے یکسر انحراف ہے۔

☜ تبلیغ دین اور اشاعت اسلام میں حکمتِ عملی کو نظر انداز کر دینا مصالح دینیہ کے خلاف ہے!

لیکن حلال اور حرام کے امتیاز میں رَواداری برتنا اور قوانین و مسائل اسلامیہ کو نرم کر دینا اسلامی روح کو کمزور کر دینے کے مترادف ہے۔

☜ آئین وسیاست سے بیگانہ ہر کر عبادت کیلئے گوشہ نشین ہو جانا زندگی سے فرار ہے!

لیکن جدا ہو دین سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی۔

☜ جاہل کو دور ہی سے سلام کر دینا عبادِ صالحین کے اَوصاف میں داخل ہے!

لیکن جاہلیت کو مٹانا اور باطل کا تعاقب کرنا عین جہاد ہے۔

اگر آپ ایسا منصفانہ اور معتدلانہ رویہ پسند کرتے ہیں تو

ماہنامہ محدث لاہور

کا مطالعہ فرمائیے، آپ اس کو ان جملہ صفات و محاسن سے مزین پائیں گے، ان شاء اللہ!

کیونکہ اس کے مضامین اسی مخصوص طرزِ فکر کے حامل ہوتے ہیں۔

ملتِ اسلامیہ کا علمی اور اصلاحی مجلہ

ماہنامہ **محدث** لاہور

مدیر اعلیٰ حافظ عبدالرحمن مدنی

مدیر معاون اکرام اللہ ساجد

جلد ۱۷ | محرم الحرام، صفر المظفر ۱۴۰۷ھ (مطابق ستمبر، اکتوبر ۱۹۸۶ء) | عدد ۱-۲

فہرست مضامین

فکر و نظر

۱۔ ترمیمی شریعت بل پر مسلمانوں کے جملہ مکاتبِ فکر کا اتفاق و اتحاد — اکرام اللہ ساجد — ۲

۲۔ متفقہ ترمیمی شریعت بل ۱۹۸۶ء — ادارہ — ۸

دار الافتاء

۳۔ نکاح و طلاق وغیرہ کے چند مسائل — مولانا سعید مجتبیٰ السعیدی — ۱۲

مقالات

۴۔ کمالاتِ نبوی قرآنِ کریم کے آئینے میں — حضرت مولانا عبدالرؤف رحمانی — ۱۵

۵۔ شریعت اور فقہ میں فرق — پروفیسر حافظ محمد سعید — ۲۷

۶۔ اسلام میں غلامی کا تصور — پروفیسر حافظ محمد ایوب — ۳۳

تحقیق و تنقید

۷۔ منکرینِ حدیث کی عربی زبان سے ناواقفی — مولانا محمد رمضان سلفی — ۴۳

۸۔ بیعتِ عقبہ ثانیہ اور حضرت عباسؓ — صاحبزادہ برق التوحیدی — ۵۴

شعر و ادب: ۹۔ دعائے دل — جناب اسرار احمد سہاوری — ۷

محدث کتاب و سنت کی روشنی میں آزادانہ بحث و تحقیق کا حامی ہے۔ ادارہ کا مضمون نگار حضرات سے کلی اتفاق ضروری نہیں۔

ناشر و حافظ عبدالرحمن مدنی — طابع: چودھری رشید احمد — مطبع: مکتبہ جدید پریس، ۴۔ شارع فاطمہ جناح، لاہور

دفتر رابطہ: ۹۹ جے ماڈل ٹاؤن۔ لاہور ۱۴ — زرِ سالانہ: -/۳۰ روپے — فی مجلہ: -/۳ روپے

فکر و نظر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

ترمیمی شریعت بل پر مسلمانوں کے جملہ مکاتبِ فکر کا اتفّاق و اتحّاد

وطنِ عزیز میں لادین عناصر، قیامِ پاکستان سے لے کر آج تک، نفاذِ شریعت کی راہ میں بری طرح حائل رہے ہیں۔ اور جب بھی اس سلسلہ میں کوئی آواز اٹھی، شریعت بیزار اس طبقہ نے فقہی اور فرقہ وارانہ اختلافات کو بہانہ بنا کر راہ مارنے کی کوشش کی ـــــ چنانچہ ان کی انہی نامسعود کوششوں کی بناء پر "آخر کس فرقہ کا اسلام نافذ کیا جائے" ملک میں عدمِ نفاذِ شریعت کا ایک مستقل عنوان بن کر رہ گیا ہے!

ـــــ حالانکہ اسلام نہ تو کسی مخصوص فرقہ کا اسلام ہے، نہ ہی کوئی فقہ شریعت ہوتی ہے۔ اور نہ ہی فقہی اختلافات شریعت کا اختلاف بن سکتے ہیں ـــــ شریعت تو صرف اور صرف کتاب و سنّت ہیں، اور اس ملک کی مختصر تاریخ میں علمائے دین نے متعدد مرتبہ کتاب و سنّت پر مکمل اتفاق کے عملی ثبوت فراہم کئے ہیں ـــــ قراردادِ مقاصد، جسے اب آئین کا حصہ بھی بنا لیا گیا ہے، علمائے دین کے اسی جذبۂ نفاذِ شریعت کی مظہر ہے، اور جس کی ایک شق یوں ہے کہ:

"ایک دستور بنایا جائے ۔ ۔ ۔ ۔ جس کی رُو سے مسلمانوں کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنی زندگی کو اسلامی تعلیمات و مقتضیات کے مطابق، جو قرآنِ مجید اور سنّتِ رسولؐ میں متعین ہیں، ترتیب دے سکیں!"

کیا یہ بات انتہائی تعجب خیز نہیں کہ ۷۳ء کے دستور کو صحیفۂ آسمانی سمجھنے والے اور اس پر امت کے اجماع تک کی خوش خبری دے ڈالنے والے بھی،

اسی دستور میں علمائے اسلام کی اس متفقہ شق کی موجودگی کے باوجود یہ پروپیگنڈا کرتے ہیں کہ مسلمان چونکہ شریعت پر متفق نہیں ہو سکتے، لہٰذا شریعتِ محمدیؐ کا نفاذ ممکن نہیں۔

پھر علمائے کرام کے بائیس۲۲ نکات بھی، جنہیں ملک بھر کے اور مختلف مکاتبِ فکر کے جید اکتیس۳۱ علماء نے متفقہ طور پر آئینی اساس کی حیثیت سے مرتب کیا تھا، شریعت دشمنوں کے اس مذموم پروپیگنڈا کی نفی کرتے ہیں —— ان بائیس نکات میں سے پہلے دو نکات حسبِ ذیل ہیں:

۱۔ "اصل حاکم تشریعی و تکوینی حیثیت سے اللہ رب العالمین ہے"۔

۲۔ "ملک کا قانون کتاب و سنّت پر مبنی ہوگا اور کوئی ایسا قانون نہ بنایا جائے گا، نہ کوئی ایسا انتظامی حکم دیا جا سکے گا، جو کتاب و سنّت کے خلاف ہو"!

—— گویا یہاں بھی کسی فرقہ وارانہ یا فقہی اختلاف کی نہ صرف کوئی رُو رعایت نہیں کی گئی، بلکہ اشارتاً بھی اس کا ذکر تک موجود نہیں ہے۔ ہاں اگر ذکر ہے تو صرف اور صرف کتاب و سنّت کی مطابقت کا، جو کتاب و سنّت پر اِن جملہ علماء کے مکمل اتفاق و اتحاد کا مظہر ہے۔

پھر تیسری مرتبہ حال ہی میں سینٹ میں نفاذِ شریعت بل ۸۵ء پیش ہوا، اور اسے عوامی آراء کے حصول کے لیے مشتہر بھی کیا گیا، تو یہ بل صرف اسی وقت تک متنازعہ فیہ رہا، جب تک اس میں شریعت کی تعریف درست نہ تھی اور جب تک اسے کتاب و سنّت کی مشترکہ بنیادوں پر جملہ مکاتبِ فکر کے اتحاد کا علمبردار نہ بنایا گیا تھا —— لیکن اب جب کہ اس کی بنیاد صرف اور صرف کتاب و سنّت پر رکھ دی گئی ہے، تو مسلمانوں کے جملہ مکاتبِ فکر بھی اس پر متفق ہو گئے ہیں —— اس بل کی دفعہ ۲ میں شق ب ج کے تحت چونکہ فقہ کو شریعت متصور کیے جانے کی بات کی گئی تھی اور اسی بناء پر یہ شقیں متنازعہ فیہ بن گئی تھیں، لہٰذا ترمیم کے ذریعے شریعت کی تعریف کو درست کر دیا گیا ہے —— چنانچہ لکھا گیا کہ:

"شریعت سے مراد قرآن و سنّت ہیں"!

جب کہ اس شق کے ضمن میں یہ "توضیح" بھی موجود ہے کہ:

"قرآن و سنّت کے احکام کی تعبیر کرتے ہوئے مندرجہ ذیل ماخذ سے راہنمائی حاصل کی جائے گی:

۱۔ سنّتِ خلفائے راشدین رضؓ۔
۲۔ تعاملِ اہلِ بیتِ عظام و صحابہ کرام رضؓ۔
۳۔ اجماعِ امّت۔
۴۔ مسلّمہ فقہائے اسلام کی تشریحات و آراء"!

اور یوں یہ ترمیمی بل متفقہ بنادیا گیا ہے، جملہ مکاتبِ فکر کے نمائندوں نے ۳۰/اگست ۸۶ء کو اس پر دستخط کر دیئے ہیں اور روزنامہ جنگ (مؤرخہ ۶ ستمبر ۸۶ء) نے "نفاذِ شریعت بل ۱۹۸۵ء" اور "متفقہ ترمیمی شریعت بل ۱۹۸۶ء" کے تقابل کی صورت میں اس کی مکمل رپورٹ بھی شائع کی ہے!

("متفقہ ترمیمی شریعت بل ۱۹۸۶ء" کا خالص متن محدث کی زیرِ نظر اشاعت میں شامل ہے)

اسی پر بس نہیں، مؤرخہ ۲۴/جولائی ۸۶ء کو فلیٹیز ہوٹل لاہور میں ایک پریس کانفرنس کا انعقاد کیا گیا، جس میں ملک کے جملہ مکاتبِ فکر کے جیّد علماء کی ایک کثیر تعداد نے شرکت کی ــــــ اس کانفرنس میں علمائے کرام کی دلچسپی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اہلحدیث کے نامور اور مایۂ ناز عالمِ دین، مدیر "الاعتصام" حضرت مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی حفظہ اللہ تعالیٰ، جو کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں اور برِصغیر پاک و ہند کی تاریخ اہلحدیث جن کے تذکرہ کے بغیر نامکمل رہ جاتی ہے، اپنی علالتِ طبع اور انتہائی ضعف و نقاہت کے باوصف (کیونکہ آپ ایک مدّت سے فالج کے زیرِ اثر صاحبِ فراش ہیں) کانفرنس میں شرکت کے لیے تشریف لائے اور کانفرنس کے اختتام پر دعائے خیر بھی آپ ہی نے فرمائی ــــــ وَعَلیٰ هٰذَا الْقِیَاسِ ــــــ اس پریس کانفرنس کا مکمل متن، جسے ملک کے جملہ مکاتبِ فکر کا متفقہ موقف، بلکہ مشترکہ اعلامیہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا،

حسب
ذیل
ہے:

"ریفرنڈم کی بنیاد پر برسرِ اقتدار حکومت کی اوّلین ذمہ داری نفاذِ شریعت ہے

متفقہ ترمیمی شریعت بل تحریکِ نظامِ مصطفٰیؐ کا ہی ایک تسلسل ہے

اسلامی نظریاتی کونسل سمیت جملہ مکاتبِ فکر کے اتفاق کے بعد بل سے انحراف خطرناک ہو گا!

برِصغیر پاک و ہند کی تاریخ اس پر گواہ ہے کہ جب بھی مسلمانوں نے متحد ہو کر کوئی تحریک چلائی تو ان کے سامنے بڑی بڑی جابر قوتوں نے گھٹنے ٹیک دیے۔ خود پاکستان کا وجود برطانوی سامراج اور ہندو اکثریت کے علی الرغم مسلم اقلیت کی کامیابی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ماضی قریب میں علماء اور مشائخ کی قیادت میں مسلم عوام اٹھے تو نہ صرف قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینا پڑا بلکہ نظامِ مصطفٰیؐ کے مطالبے کے سامنے مضبوط کرسی بھی نہ ٹھہر سکی۔

پاکستان کی پہلی اسمبلی کی طرف سے قرار دادِ مقاصد کی منظوری اسی اسلامی جذبے کی مرہونِ منت تھی لیکن پھر اسلام کے عملی نفاذ کے خلاف لادین اور ملک کی نظریاتی اساس کے مخالف عناصر نے یہ پروپیگنڈا کیا کہ مسلمان شریعت پر متفق نہیں ہو سکتے لہٰذا محمدی شریعت کا نفاذ ممکن نہیں۔

آج ہم جملہ مکاتبِ فکر کے نمائندے بیک آواز ہیں کہ ہم نفاذِ شریعت کے لیے متحد ہیں اور ان شاء اللہ متحد رہیں گے۔ پاکستان کی اسلامی ریاست کے دستور کے لیے ہمارے اکابرین نے اسی چیلنج کا جواب بائیس (۲۲) نکات کی صورت میں دیا تھا اور انہی ۲۲ نکات کے ایک اہم قانونی پہلو کی تکمیل کے لیے متفقہ شریعت بل تیار کیا گیا ہے۔ افسوس کہ جس طرح ملک کے اکتیس ۳۱ جید علماء کے متفقہ بائیس ۲۲ نکات کو آج تک قانونی حیثیت نہ دی گئی اسی طرح آج بھی شریعت بل سے پہلو تہی کی جا رہی ہے۔

ہم حکومت پر یہ واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ متفقہ شریعت بل تحریکِ نظامِ مصطفٰیؐ کا ہی ایک تسلسل ہے۔ خود صدر جنرل ضیاء الحق کا اقتدار اسی تحریک کے طفیل ہے اور ریفرنڈم کے بعد موجودہ سول حکومت کا جواز بھی اسلامی نظام کی تکمیل کے وعدے پر قائم ہے۔ اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارش کے باوصف جملہ مکاتبِ فکر کا متفقہ مطالبہ تسلیم نہ کرنا ملک و

ملت کے لیے خطرناک ہوگا۔ کیونکہ نفاذِ شریعت کا مسئلہ سیاست بازی کا نہیں، ملک وملت کی بقا کا ہے۔

شریعت بل کے مشتہر ہونے کے بعد اس پر آراء سامنے آئیں تو ضرورت محسوس کی گئی کہ بل کے مندرجات کو قانونی شکل دینے کے لیے بعض ترامیم کی جائیں اور اس تاثر کو بھی قطعی طور پر ختم کر دیا جائے کہ مجوزہ شریعت بل متفقہ نہیں ہے۔ چنانچہ اب جملہ مکاتبِ فکر کے نمائندوں نے بل کو متفقہ بنا لیا ہے۔ بالخصوص دفعہ ۲ اور ۲۰ پر چونکہ اختلافی آراء سامنے آئی تھیں، ان میں ترمیم کر دی گئی ہے۔ جس سے فرقہ واریت اور اختلافی ہونے کا سدِّباب ہو گیا ہے۔ ہم واضح کرتے ہیں کہ نویں آئینی ترمیم شریعت بل کا متبادل نہیں ہے۔ بلکہ حکومت نے نظامِ مصطفیٰ کے مکمل نفاذ سے بچنے کے لیے اس کا سہارا لیا ہے، جس سے نفاذِ شریعت کے تقاضے پورے نہیں ہوتے۔

ہم دوٹوک الفاظ میں اعلان کرتے ہیں کہ ہم سب نے متحد ہو کر مکمل نفاذِ شریعت کے لیے ملک گیر تحریک چلانے کا فیصلہ کر لیا ہے اور اسی سلسلہ میں ۱۱ اکتوبر کو کل پاکستان نفاذِ شریعت کنونشن ہوگا۔ جس میں تمام مکاتبِ فکر کے ہزاروں علماء ملک بھر سے شریک ہوں گے۔ لہٰذا رابطہ کمیٹیوں نے ملک گیر دورے شروع کر دیئے ہیں۔

حکومت اور شریعت کے مخالفین کو ہم بتا دینا چاہتے ہیں کہ علماء نفاذِ شریعت کے خلاف کسی سازش کو کامیاب نہیں ہونے دیں گے اور کسی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے۔ ان شاء اللہ!

وطنِ عزیز میں نفاذِ شریعت کے لیے متحدہ شریعت محاذ کے اس مشترکہ اعلامیہ کے بعد شریعت بیزار ٹولہ کے اس مذموم پروپیگنڈا کی کوئی حقیقت باقی نہیں رہ جاتی کہ علماء دین چونکہ شریعت پر متفق نہیں، لہٰذا ملک میں محمدی شریعت کا نفاذ ممکن نہیں ——— علماء دین نفاذِ شریعت کے مطالبہ پر متفق ہو چکے ہیں اور تاریخ گواہ ہے کہ مسلمانوں کی متحدہ کوششیں بحمد اللہ ہمیشہ بارآور ہوئی ہیں ——— ہم جہاں حکومت سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ شریعت بل کو منظور کرتے

ہوئے، جملہ مسلمانوں کا نفاذِ شریعت کا دیرینہ مطالبہ پورا کیا جائے تاکہ قوم کو اس کی گمشدہ منزل مل جائے اور یہ ملک بھی اپنی نظریاتی سرحدوں پر استوار ہو سکے، وہاں جملہ خواص و عام سے بھی یہ اپیل کریں گے کہ وہ اس راہ میں کانٹے بکھیرنے کی کوشش نہ کریں، بلکہ متحدہ شریعت محاذ کے شانہ بشانہ چل کر ان سے تعاون کریں!

—— اور اللہ تعالیٰ سے ہماری یہ عاجزانہ درخواست ہے کہ اے اللہ، جو لوگ تیری راہ میں بہ خلوصِ نیت چل نکلے ہیں، ان کی نصرت و اعانت فرما، ان کو استقامت دے اور اس مبارک اتحاد کی بدولت ان کے دامن اپنی رحمت سے مالا مال کر دے —— یہ تیرا وعدہ ہے کہ:

"وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ" —— وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ —— آمین!

(اکرام اللہ ساجد)

شعر و ادب

دُعائے دل

جناب اسرار احمد سہاروی

لذتِ ذوقِ بے گناہی دے
دولتِ آہِ صبحگاہی دے
میرا ذوقِ طلب ہے تشنہ ہنوز
وسعتِ غم میں بے پناہی دے
وہ عزیمت مجھے عطا فرما
دار پر جا کے جو گواہی دے
یہ دعا ہے کہ اور کچھ نہ سہی
دلِ محرومِ مدعا ہی دے
تیری رحمت کا میں بھی طالب ہوں
اک دلِ درد آشنا ہی دے
دل گرفتہ ہوں ایک مدت سے
ایک پیغام دل کشا ہی دے
فتنہ بردوش ہر طرف ہے جنوں
حوصلہ زیست کا الٰہی دے
دل کو مایوسیوں نے گھیر لیا
اپنی رحمت کا آسرا ہی دے
اپنی رحمت سے یہ کرم کر دے
داغِ عصیاں میرا مٹا ہی دے
گر نہیں مستحق کرم کا میں
جرمِ اُلفت کی کچھ سزا ہی دے
اُس کا حسنِ کرم ہے اسرار
فقرِ بوذرؓ میں ذوقِ شاہی دے

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

متفقہ ترمیمی شریعت بل
۱۹۸۶ء

ابتدائیہ:

ہر گاہ کہ قراردادِ مقاصد، جو پاکستان میں شریعت کو بالادستی عطا کرتی ہے، کو دستورِ اسلامی جمہوریہ پاکستان ۱۹۷۳ء کا مستقل بالذات حصہ بنا دیا گیا ہے۔

اور ہر گاہ کہ مذکورہ قراردادِ مقاصد کے اغراض کو بروئے کار لانے کے لیے ضروری ہے کہ شریعت کے فی الفور نفاذ کو یقینی بنایا جائے۔

لہٰذا حسبِ ذیل قانون بنایا جاتا ہے۔

دفعہ ۱۔ مختصر عنوان، وسعت اور آغازِ نفاذ:

(الف) اس ایکٹ کو "نفاذِ شریعت ایکٹ ۱۹۸۶ء" کہا جائے گا۔

(ب) یہ ایکٹ تمام پاکستان پر وسعت پذیر ہوگا۔

(ج) اس ایکٹ میں شامل کسی امر کا اطلاق غیر مسلموں کے شخصی قوانین پر نہ ہوگا۔

(د) یہ ایکٹ فوری طور پر نافذ العمل ہوگا۔

دفعہ ۲۔ تعریفات:

اس ایکٹ میں تاوقتیکہ متن سے کوئی مختلف مفہوم مطلوب ہو، مندرجہ ذیل اصطلاحات سے وہ مفہوم مراد ہے جو ذیل میں انہیں دیا گیا ہے۔ یعنی:

(الف) "قراردادِ مقاصد" سے مراد وہ مفہوم ہے جو آرٹیکل ۲ الف دستورِ اسلامی جمہوریہ پاکستان ۱۹۷۳ء میں اُسے دیا گیا ہے۔

(ب) "مقررہ" سے مراد اس ایکٹ کے تحت مقررہ قواعد ہیں۔

(ج) "شریعت" سے مراد قرآن و سنت ہیں۔

توضیح: قرآن و سنت کے احکام کی تعبیر کرتے ہوئے درج ذیل مآخذ سے رہنمائی

حاصل کی جائے گی:

(۱) سنّتِ خلفائے راشدین رض

(۲) تعاملِ اہلِ بیتِ عظام و صحابہ کرام رض

(۳) اجماعِ اُمّت

(۴) مسلّمہ فقہائے اسلام کی تشریحات و آراء

دفعہ ۳۔ شریعت کی دیگر قوانین پر بالاتری:

کسی دیگر قانون، رواج، تعامل یا بعض فریقوں کے مابین معاملہ یا لین دین میں شامل کسی بھی امر کے اس سے مختلف ہونے کے باوجود شریعت پاکستان میں بالاتر قانون کی حیثیت سے مؤثر ہوگی۔

دفعہ ۴۔ عدالتیں شریعت کے مطابق مقدمات کا فیصلہ کریں گی:

ملک کی تمام عدالتیں تمام امور و مقدمات بشمول مالی امور وغیرہ میں شریعت کے مطابق فیصلہ کرنے کی پابند ہوں گی اور شریعت کے خلاف فیصلوں کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہوگی۔ اگر کسی عدالت میں یہ سوال اٹھایا جائے کہ آیا کوئی قانون یا فیصلہ شریعت کے منافی ہے تو اس مسئلہ کے تصفیہ کے لیے وفاقی شرعی عدالت سے رجوع کیا جائے گا۔

دفعہ ۵۔ وفاقی شرعی عدالت کا دائرۂ اختیار:

وفاقی شرعی عدالت کا دائرۂ اختیارِ سماعت و فیصلہ بلا استثنیٰ تمام امور و مقدمات پر حاوی ہوگا۔

دفعہ ۶۔ شریعت کے خلاف احکامات دینے پر پابندی:

انتظامیہ کا کوئی بھی فرد، بشمول صدرِ مملکت اور وزیرِ اعظم، شریعت کے خلاف کوئی حکم نہیں دے سکے گا۔ اور اگر ایسا کوئی حکم دیا گیا تو اس کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہوگی اور اسے وفاقی شرعی عدالت میں چیلنج کیا جا سکے گا بشرطیکہ شکایت کنندہ کے لیے کوئی اور قانونی مداوا موجود نہ ہو۔

دفعہ ۷۔ عدالتی عمل اور احتساب:

حکومت کے تمام عمّال، بشمول صدرِ مملکت، اسلامی قانونِ عدل کے مطابق احتساب سے بالاتر نہیں ہوں گے۔

دفعہ ۸۔ مسلّمہ اسلامی فرقوں کے شخصی معاملات ان کے اپنے اپنے فقہی مسلک کے مطابق طے کئے جائیں گے۔

دفعہ ۹۔ غیر مسلم کو تبلیغ کی آزادی:

یہ شق حذف کر دی گئی ہے (کیونکہ دفعہ (۱) کی شق (ج) کے بعد اس کی ضرورت نہیں)

سفارشی دفعہ ۱۰۔ علماء کو جج مقرر کیا جائے گا:

تمام عدالتوں میں حسبِ ضرورت تجربہ کار اور جید علمائے دین کا بحیثیتِ جج اور معاونینِ عدالت تقرر کیا جائے گا۔

سفارشی دفعہ ۱۱ ججوں کی تربیت کے انتظامات:

علومِ شرعیہ اور اسلامی قانون کی تعلیم اور ججوں کی تربیت کا ایسا انتظام کیا جائے گا کہ مستقبل میں علومِ شرعیہ اور خصوصاً اسلامی قانون کے ماہر جج تیار ہو سکیں۔

دفعہ ۱۲۔ قرآن و سنّت کی تعبیر کا طریقِ کار:

قرآن و سنت کی تعبیر کا طریقِ کار وہی معتبر ہوگا جو مسلّمہ مجتہدین کے علمِ اصولِ تفسیر اور علمِ اصولِ حدیث و فقہ کے مسلّمہ قواعد اور ضوابط کے مطابق ہو۔

دفعہ ۱۳ عمّالِ حکومت کے لیے شریعت کی پابندی:

انتظامیہ، عدلیہ اور مقننّہ کے ہر فرد کے لیے فرائضِ شریعت کی پابندی اور محرّمات سے اجتناب کرنا لازم ہوگا۔

"جو شخص اس کی خلاف ورزی کا مرتکب ہوگا، وہ مستوجبِ سزا ہوگا۔ (یہاں کوئی سزا متعین کر دی جائے) بشرطیکہ کسی دیگر قانون کے تحت یہ جرم مستوجبِ سزا نہ ہو"

دفعہ ۱۴۔ ذرائع ابلاغ کی تطہیر:

تمام ذرائع ابلاغ سے خلافِ شریعت پروگراموں، فواحش اور منکرات کی اشاعت ممنوع ہو گی۔ جو شخص اس کی خلاف ورزی کا مرتکب ہوگا، مستوجبِ سزا ہوگا (یہاں متعین طور پر سزا کا ذکر کرنا مناسب ہوگا مثلاً دو سال قید بامشقت اور جرمانہ) بشرطیکہ کسی دوسرے

قانون کے تحت یہ جرم مستوجب سزا نہ ہو۔

دفعہ ۱۵۔ حرام کی کمائی پر پابندی:

خلافِ شریعت کاروبار کرنا اور حرام طریقوں سے دولت کمانا ممنوع ہوگا۔ جو شخص اس کی خلاف ورزی کا مرتکب ہوگا، مستوجبِ سزا ہوگا (یہاں سزا متعین کی جائے گی)، بشرطیکہ کسی دوسرے قانون کے تحت یہ جرم مستوجبِ سزا نہ ہو۔

دفعہ ۱۶۔ بنیادی حقوق کا تحفظ:

شریعت نے جو بنیادی حقوق باشندگانِ ملک کو دیئے ہیں، اُن کے خلاف کوئی حکم نہیں دیا جائے گا۔

دفعہ ۱۷۔ قواعد سازی کے اختیارات:

اس ایکٹ کے مقاصد کے حصول اور شریعت کے عملی نفاذ اور اس قانون پر عملدرآمد کرانے کے لیے مرکزی حکومت کو اختیار ہوگا کہ ضروری قواعد وضع کرے۔ اُن قواعد کا نفاذ اُس دن سے ہوگا جس دن مرکزی حکومت اُنہیں گزٹ میں شائع کرے گی۔

(نمائندگان کے دستخط)

۱۔ محمد عبدالقیوم ناظم اعلیٰ جامعہ نظامیہ رضویہ لاہور
۲۔ حافظ عبدالرحمٰن مدنی رابطہ علمائے اہل حدیث پاکستان
۳۔ محمد اجمل غفر کہ نائب امیر مرکزیہ جمعیۃ علماء اسلام پاکستان
۴۔ محمد اسلم سلیمی نائب قیّم جماعت اسلامی پاکستان
۵۔ میاں شیر عالم ایڈووکیٹ لاہور نائب صدر ورلڈ ایسوسی ایشن آف مسلم جیورسٹز

خط وکتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں ورنہ تعمیل ممکن نہ ہوگی۔
محدّث میں اشتہار دے کر اپنی تجارت کو فروغ دیں۔

شکریہ! (مینجر)

دارالافتاء حضرت مولانا سعید مجتبیٰ السعیدی

نکاح وطلاق وغیرہ کے چند مسائل

محمد سعید صاحب گوجرانوالہ سے لکھتے ہیں :

۱۔ بلوغت سے قبل جو نکاح کیا جائے، کیا یہ نکاح شرعی طور پر جائز ہوگا یا نہیں ؟

۲۔ طلاق زبانی دینا کافی ہے یا تحریری دینا ضروری ہے ؟

۳۔ رخصتی سے قبل طلاق کے واقعہ ہونے کی صورت میں کتنا حق مہر ادا کرنا پڑتا ہے ؟

۴۔ طلاق کے بعد جہیز کا شرعی حکم کیا ہے، آیا وہ لڑکے کے پاس رہے گا یا واپس لڑکی کو دیا جائے گا ؟

۵۔ کوئی شخص زبانی طلاق دے دے، اس کے بعد اس لڑکی کا نکاح دوسری جگہ کیا جائے تو کیا نکاح خوان کے اور گواہوں کے نکاح متاثر ہوں گے یا کہ نہیں اور کیا ایسے نکاح خواں کے پیچھے نماز ہو جاتی ہے ؟

الجواب :

۱۔ واضح ہو کہ صغر سنی میں بلوغت سے قبل جو نکاح کیا جائے شرعاً واقع ہو جاتا ہے بشرطیکہ لڑکی اس نکاح پر رضا مندی کا اظہار کر دے۔

خود آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے جب نکاح کیا تھا، تب ان کی عمر چھ سات سال تھی، اور رخصتی بلوغت کے بعد ہوئی تھی اور اگر چھوٹی عمر کے نکاح پر لڑکی راضی نہ ہو تو وہ نکاح شرعاً صحیح نہیں۔

سنن ابن ماجہ (ص ۱۳۶) میں ہے کہ ایک نوجوان عورت آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئی۔ اس نے بیان کیا "میرے باپ نے میرا نکاح اپنے بھتیجے سے کر دیا ہے تاکہ اس طریقہ سے وہ اپنی بدحالی کو زائل کر سکے"، آپ نے یہ بیان سن کر لڑکی کو اختیار دے دیا۔

تب اس لڑکی نے کہا "میں اپنے باپ کے کیے ہوئے نکاح کو باقی رکھتی ہوں۔ میں صرف یہ چاہتی تھی کہ عورتوں کو پتہ چل جائے کہ لڑکی کے نکاح کے بارہ میں آباء کو جبر کا کوئی حق حاصل نہیں ۔"

اسی طرح سنن ابن ماجہ ص ۱۳۶ اور سنن ابی داؤد ۱/۲۹۲ پر ہے،

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان فرماتے ہیں کہ ایک کنواری لڑکی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئی اور کہا "میرے باپ نے میرا نکاح کر دیا ہے لیکن مجھے پسند نہیں" تو آپ نے اسے اختیار دے دیا۔

ان احادیث مبارکہ سے معلوم ہوا کہ اگر لڑکی راضی نہ ہو تو صغر سنی کا نکاح درست ہوگا اور اگر لڑکی اس نکاح کو رد کرنا چاہے تو اسے اختیار ہے۔

۲۔ طلاق کا مفہوم صرف اس قدر ہے کہ خاوند اپنی بیوی کو خود سے جدا کر کے آزاد کر دے۔ طلاق دینا اگرچہ شرعاً جائز ہے لیکن یاد رہے کہ جائز اور حلال ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ کو یہ فعل انتہائی ناپسند ہے —— ایک حدیث میں آیا ہے:

" اَبْغَضُ الْحَلَالِ اِلَى اللّٰهِ الطَّلَاقُ "

(ابوداؤد مع عون المعبود جلد ۲ ص ۲۲۱)

کہ "تمام حلال کاموں میں سے سب سے ناپسندیدہ اور مبغوض فعل اللہ کے ہاں طلاق ہے۔"

اس لیے کسی اشد مجبوری کے بغیر طلاق نہیں دینی چاہیئے۔

طلاق زبانی دی جائے یا تحریری، واقع ہو جاتی ہے۔ تحریری طلاق دینا کوئی ضروری نہیں۔

۳۔ رخصتی سے قبل اگر طلاق دے دی جائے تو خاوند کے ذمہ مقرر کردہ حق مہر میں سے نصف کی ادائیگی ضروری ہے۔

قرآن کریم میں ہے:

" وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ - الآية ! " (البقرۃ : ۲۳۷)

کہ "اگر تم خلوت سے قبل طلاق دے دو تو مقرر کردہ حق مہر میں سے نصف

(کی ادائیگی کرو)۔

ہاں اگر خاوند بطورِ احسان مکمل ادا کر دے تو یہ اس کے لیے افضل اور بہتر ہے۔ اسی طرح عورت اگر چاہے تو نصف مہر، جو اس کا حق بنتا ہے، معاف کر سکتی ہے۔

۴۔ جہیز عموماً لڑکی کے والدین لڑکی کو دیتے ہیں، اس لیے وہ لڑکی کا حق ہے۔ اختلاف کی صورت میں لڑکی کے والدین سے وضاحت کرائی جا سکتی ہے کہ انہوں نے یہ سامان لڑکے کو دیا یا لڑکی کو؟ اگر انہوں نے لڑکے کو دیا ہو تو جہیز دے کر واپس لینا مستحسن نہیں۔ اور اگر لڑکی کو دیا ہو تو یہ سامان لڑکی کا ہے، جب اسے طلاق دے دی گئی تو وہ اپنا سامان بھی واپس لے جا سکتی ہے۔ اسے روکا نہیں جا سکتا۔

۵۔ جب کوئی شخص اپنی بیوی کو زبانی طلاق دے دیتا ہے تو یہ طلاق معتبر ہے۔ رجعی طلاق کی صورت میں عدت کے اندر وہ شخص چاہے تو رجوع کر لے، ورنہ بعد از عدت اس عورت کا نکاح دوسری جگہ کرنا جائز اور درست ہے۔

—— عدت کے بعد دوسری جگہ نکاح کرنے پر نکاح خواں اور گواہان کسی جرم کے مرتکب نہیں۔ لہٰذا اس سے ان کے اپنے نکاح پر کوئی اثر نہیں ہوگا ان کے نکاح درست ہیں اور ایسے نکاح خواں کے پیچھے نماز درست ہے۔

یاد رہے کہ اگر بالفرض کوئی شخص غلط نکاح پڑھا دے تو وہ اپنی جگہ مجرم اور گناہ کار ہے تاہم اس سے اس کے اپنے نکاح پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔

هٰذَا مَا عِنْدِي وَاللّٰهُ أَعْلَمُ بِالصَّوَابِ!

خلافت و جمہوریت

از قلم

مولانا عبدالرحمٰن کیلانی

دوسرا ایڈیشن شائع ہو گیا ہے!

ضخامت ۲۸۸ صفحات

مجلد سنہری ڈائیدار —— قیمت ۳۸ روپے

ناشر: ادارہ محدث ۹۹ جے ماڈل ٹاؤن لاہور ۱۴

مقالات

حضرت مولانا عبدالرؤف رحمانی جھنڈانگری (انڈیا)

کمالاتِ نبوی قرآنِ کریم کے آئینہ میں

رسولِ کریم جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ قدسی صفات پر جس قدر غور کیا جائے، صاف نظر آتا ہے کہ آپؐ کی ذات بابرکات تمام انبیاء کرامؑ کے محاسن و خصائص پر حاوی تھی اور جملہ اوصاف و کمالات کی جامع تھی۔ علامہ سیوطیؒ نے اپنی کتاب "خصائص" ج میں ایک مستقل موضوع مقرر کیا ہے۔ جس میں ہر نبیؑ کے مشہور اوصاف و معجزات کے ساتھ ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے محاسن کا باحسن وجوہ مقابلہ کیا ہے۔ تفصیل "خصائص" میں ملاحظہ فرمایئے۔ سرِدست "خصائص" سے ایک معجزہ "احیاء" پر کچھ عرض ہے:

امام بیہقی راوی ہیں کہ امام شافعیؒ نے ایک بار فرمایا "ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے جس قدر معجزات عطا فرمائے، اس قدر کسی اور نبیؑ کو نہیں دیئے گئے"۔ ایک شخص نے پوچھا کہ "حضرت عیسیٰؑ کے معجزہ "احیاء موتیٰ" کے مقابلہ میں حضورؐ کو کیا عطا کیا گیا تھا؟" امام صاحب نے فرمایا:

"أُعْطِیَ مُحَمَّدٌ حَنِیْنَ الْجِذْعِ فَهٰذَا اَكْبَرُ مِنْ ذٰلِكَ"

یعنی "کھجور کے رونے تھرتھرانے کا واقعہ جو موجود ہے، یہ احیاءِ موتیٰ سے بڑھ کر ہے۔ کیونکہ مردہ کو موت سے پہلے روح سے تعلق ہوتا ہے مگر اس کھجور کے ستون میں نہ کبھی روح تھی اور نہ حیاتِ ظاہری کا محل تھا۔ لیکن آپؐ کا معجزہ تھا کہ ایک سوکھے نباتاتی جسم میں انسانی صفات و خواص پیدا ہو گئے۔

اسی طرح دیکھئے حضرت موسیٰؑ کا عصا سانپ بن کر معجزہ نمائی کر رہا تھا تو کھجور کا تنا اپنی شکل پر رہتے ہوئے اپنے احساس اور محبتِ رسولؐ کا ثبوت دے رہا تھا۔ اس لیے یہ معجزہ محمدیؐ، معجزۂ موسویؑ سے بڑھ کر ہے۔ کیونکہ عصا بعد انقلابِ ماہیت

اژدھا بن کر اِدھر اُدھر دوڑا تو اس کی یہ کیفیت انقلاب ماہیت کے بعد ظاہر ہوئی اس سے پہلے نہیں - اور ظاہر ہے سانپ کی شکل کو سانپ کے افعال وحرکات سے قوی مناسبت ہے - اس سے وہی کام سرزد ہوا جو سانپ ہو کر ظہور میں آنا چاہیئے تھا - کوئی ایسا کام نہیں ہو سکا جو صرف انسان سے صادر ہوتا ہے - لیکن نخلہ، جو حضورؐ کو ٹیک کا کام دیتا تھا، جب آپؐ جمعہ کا خطبہ دینے کے لیے اس سے ہٹ کر منبر پر کھڑے ہوئے تو یہ فراقِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بے چین ہو کر رونے اور چلّانے لگا -

نخلہ کی ماہیت میں کوئی تغیر وتبدّل نہیں ہوا - اس کے باوجود اس سے ایسا فعل صادر ہوا جو اس سے مناسبت نہیں رکھتا تھا - بلکہ وہ انسانوں کے ساتھ مخصوص تھا - اور انسان بھی وہ کہ جن کا افرادِ کاملہ میں شمار ہو اور جو سوز و گداز کے حامل ہوں -

اب ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت وجامعیتِ اوصاف کے باب میں قرآنِ کریم سے چند مثالیں پیش کر رہے ہیں - اس کی پوری تفصیل رحمۃ للعالمینؐ میں ہے، جسے ہم اختصار کے ساتھ مع ترجمہ وتفسیر ذکر کرتے ہیں :

۱- آدم علیہ السلام کی بابت ارشاد ہے :

"وَعَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا - الآیۃ" (البقرۃ : ع ۴)

"اور اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو (بعد پیدائش) سب چیزوں کے نام سکھلائے"

اللہ تعالیٰ نے اس آیتِ کریمہ میں آدم علیہ السلام کو اپنا شاگرد بتایا ہے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو استاذِ عالم قرار دیا ہے :

"وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ" (البقرۃ : ع ۱۸)

"اور تمہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتے ہیں - علاوہ ازیں، وہ (باتیں بھی سکھاتے ہیں جنہیں تم پہلے سے نہ جانتے تھے"

اس آیت میں کتاب وسنت کے علاوہ فقرہ "مَا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ" کے تحت بے شمار اسرار و غوامض بھی آ گئے -

۲- آدم علیہ السلام کی بابت فرمایا :

"وَلَقَدْ عَهِدْنَا اِلٰۤى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ - الآیۃ" (طٰہٰ : ع ۶)

"اور ہم نے اس سے پہلے آدمؑ کی طرف ایک حکم بھیجا پھر وہ بھول گئے۔"

نبی پاکؐ کی بابت ارشاد ہے:

"سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسَىٰ" (الاعلیٰ : ع ۱)

"(اے رسولؐ) ہم عنقریب آپ کو پڑھائیں گے پھر آپؐ اسے نہ بھولیں گے۔"

نسیان کو آدمؑ کی طرف اور عدمِ نسیان کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے آپؐ کو افضل قرار دیا۔

حضرت آدمؑ کی بابت فرمایا:

"وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا الآیۃ" (البقرۃ: ع ۴)

"اور جب ہم نے تمام فرشتوں کو حکم دیا کہ آدمؑ کو سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کو اس سے بھی زیادہ نمایاں فرمایا:

"إِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ۔ الآیۃ" (احزاب: ع ۷)

"بیشک اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے نبیؐ پر درود بھیجتے ہیں۔"

اس میں دوام و استمرار بھی پایا جاتا ہے۔

۳۔ حضرت ادریسؑ کے متعلق اللہ عزوجل نے ارشاد فرمایا:

"وَرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا" (مریم: ع ۴)

"اور ہم نے انہیں اونچے مکان پر اٹھا لیا۔"

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں فرمایا:

"وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ" (انشراح: ع ۱)

"اور ہم نے آپؐ کا ذکر بہت بلند کر دیا۔"

اس کی بیّن دلیل یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسمِ گرامی اذان، تکبیر، تشہد، خطبہ نماز وغیرہ میں ہمیشہ لیا جاتا ہے۔

۴۔ حضرت الیاس علیہ السلام کا وعظ قرآن شریف میں مذکور ہے:

"أَتَدْعُوْنَ بَعْلًا وَّتَذَرُوْنَ أَحْسَنَ الْخٰلِقِيْنَ" (صافات: ع ۴)

"کیا تم بعل (جیسے بے جان بُت) سے دعائیں مانگتے ہو اور سب سے بہتر خالق یعنی اللہ کو چھوڑ بیٹھے ہو؟"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بتوں کا نام لے کر ان کی کھل کر تردید فرمائی، ارشاد ہے:

"اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى اِنْ هِيَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ" (سورہ نجم: ع ۱)

"بھلا تم لات، عزّیٰ اور تیسرے مناۃ پر بھی غور کرو (یعنی جو خود تراشیدہ بے جان اور محتاج ہیں) کیا تمہارے لیے بیٹے اور خدا کے لیے بیٹیاں ہیں، یہ تقسیم بڑے نقصان والی ہے۔ یہ تمہارے معبود صرف نام ہی نام کے ہیں، جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں۔ اللہ نے اِن ناموں پر کوئی دلیل نہیں اتاری ہے۔"

۵۔ حضرت نوحؑ کے نام پر احمد مجتبیٰؐ کے نام کو مقدم کر کے فضیلت بیان فرمائی:

"اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْ بَعْدِهٖ" (سورۂ نساء: ع ۲۳)

"ہم نے آپؐ کی طرف وحی کی جیسا کہ ہم نے نوحؑ کی طرف اور ان کے پیچھے اور انبیاءؑ کی طرف وحی کی تھی۔"

نوحؑ کے بارے میں ارشاد ہوا:

"اِنَّآ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖٓ - الآیۃ!" (سورۂ نوح: ع ۱)

"ہم نے نوحؑ کو ان کی قوم کی طرف بھیجا۔"

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ارشاد ہے:

"قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا - الآیۃ!" (الاعراف: ع ۲۰)

"آپؐ کہہ دیجئے کہ "اے لوگو! تم سب کی طرف میں اللہ کا رسولؐ ہو کر آیا ہوں۔"

یعنی نوحؑ صرف ایک قوم کی طرف مبعوث ہوئے جبکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تمام عالمِ اسلامی کے لیے رہبر بنائے گئے۔

۶۔ حضرت صالحؑ کا وعظ قرآنِ پاک میں مذکور ہے:

"یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ" (سورۂ ہود ع۶)

"اے میری قوم، اللہ کی عبادت کرو کہ اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔"

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وعظ تمام عالمِ اسلامی کے لیے ہے:

"قُلْ يٰعِبَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ؕ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ؕ وَاَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةٌ ؕ"

(سورۂ زمر ع۲)

"آپ (میری طرف سے فرما دیجئے" اے میرے ایماندار بندو! اپنے پروردگار سے ڈرتے رہا کرو (کیونکہ) جو لوگ نیک اعمال ہیں اسی دنیا میں ان کے حصہ میں ہر طرح کی بھلائی ہے اور اللہ کی زمین فراخ ہے۔"

۷۔ حضرت ابراہیمؑ کی شان میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰۤى اِبْرٰهِيْمَ" (سورۂ انبیاء ع۵)

"ہم نے آگ کو حکم دیا کہ اے آگ تو ابراہیمؑ کے لیے سرد اور سلامتی والی بن جا۔"

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بابت بایں طور ارشاد ہے:

"كُلَّمَاۤ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ" الآیۃ (سورۂ مائدہ ع۹)

"جب کبھی مسلمانوں کے مقابلہ میں لڑائی کی آگ بھڑکائیں گے، خدا اس آگ کو بجھا دے گا۔"

اس میں استمرار پایا جاتا ہے۔

ابراہیمؑ کے خُلق کی تعریف میں فرمایا:

"اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ" (توبہ: ع۱۴)

"بے شک ابراہیمؑ بڑے ہی نرم دل اور بردبار تھے۔"

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف میں ارشاد ہے:

"وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ" (ن: ع۱)

"اور بے شک آپؐ اعلیٰ خلق پر قائم ہیں۔"

۸۔ حضرت لوط علیہ السلام کے اعداء کی تباہی کے لیے فرشتوں کا اترنا یوں مذکور ہے:

"يٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ يَّصِلُوْۤا اِلَيْكَ"

(سورۃ ہود: ع ۷)

"فرشتوں نے کہا اے لوط! ہم آپ کے پروردگار کے ایلچی ہیں، یہ ہرگز آپ تک نہ پہنچ سکیں گے۔"

نبی کریمؐ کی شانِ والا میں فرشتوں کی عظیم تعداد بیان کر کے فرمایا:

"هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ آلَافٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ۔" (سورۃ آل عمران: ع ۱۳)

"پانچ ہزار فرشتوں کی لیس اور تیار فوج سے اللہ آپؐ کی مدد فرمائے گا۔"

اور حفاظت سے متعلق فرمایا گیا:

"وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ۔" (مائدہ: ع ۱۰)

"اللہ آپ کو لوگوں کی تکلیف سے محفوظ رکھے گا۔"

۹۔ حضرت اسماعیلؑ کی صفات میں فرمایا:

"اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ۔ الآیۃ!" (مریم: ع ۴)

"وہ وعدہ کے سچے تھے۔"

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں فرمایا:

"وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ۔ الآیۃ!" (احزاب: ع ۲)

"اور اللہ اور اس کے رسولؐ نے سچ فرمایا۔"

اُدھر صدق کو صرف وعدہ کی طرف منسوب کیا ہے، ادھر آپؐ کے تمام افعال و اقوال کے لیے اسے عام فرمایا ہے۔

۱۰۔ حضرت اسحاقؑ کی بابت وارد ہے:

"وَبَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ۔ الآیۃ!" (صافات: ع ۳)

"ہم نے ابراہیمؑ کو اسحاقؑ کی بشارت دی۔"

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بابت سینکڑوں برس قبل بذریعہ عیسیٰؑ بشارت پہنچائی:

"وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ۔" (صف: ع ۱)

"اور ایک رسولؐ کی خوشخبری سناتا ہوں، جو میرے بعد آئے گا اور جس کا نام احمدؐ ہوگا۔"

۱۱۔ حضرت یعقوبؑ اپنے قصوروار فرزندوں کی اس درخواست پر کہ ہمارے قصور معاف کرا دیجئے یوں ارشاد فرماتے ہیں:

"سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ" (یوسف: ع ۱۱)

"میں تمہارے لیے خدا سے بخشش مانگوں گا (امید ہے کہ خدا قبول کریگا) کیونکہ وہی بڑا بخشنے والا ہے"

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں بلا درخواست یوں فرمایا گیا:

"وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا" (سورۂ نساء: ع ۹)

"اور جب انہوں نے بوجہ انکار کے اپنا بُرا کیا تھا، آپؐ کے پاس آکر خدا سے بخشش مانگتے اور رسولؐ بھی ان کے لیے بخشش مانگتے تو اللہ کو ضرور اپنے حق میں معافی دینے والا مہربان پائیں گے۔"

(۱۲) حضرت یوسفؑ کے رؤیا کا ذکر قرآنِ مجید میں ہے:

"اِنِّيْ رَاَيْتُ اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَاَيْتُهُمْ لِيْ سٰجِدِيْنَ" (الیوسف: ع ۱)

"بیشک میں نے گیارہ ستارے اور سورج اور چاند کو خواب میں دیکھا ہے کہ وہ مجھے سجدہ کر رہے ہیں۔"

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے رؤیا میں ذکر ہے:

"لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ لَا تَخَافُوْنَ" (سورۂ فتح: ع ۴)

"اللہ نے اپنے رسولؐ کا خواب بالکل سچا کر دیا، کہ تم لوگ مسجد حرام میں ضرور داخل ہو گے۔ ان شاء اللہ! اس حال میں کہ تم سر منڈائے اور بال ترشوائے ہوئے ہو گے۔ کسی کا خوف تم کو نہ ہو گا۔"

یوسفؑ کا رؤیا ان کے ذاتی مرتبہ کو ظاہر کرتا ہے اور حضورؐ کا رؤیا پوری قوم کی صلاح و فلاح کی ایک عظیم بشارت ہے۔

۱۳۔ حضرت شعیب ؑ نے اپنی قوم کو وزن کے باقاعدہ رکھنے پر یہ وعظ فرمایا:

"وَيٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ ۔ الآیۃ!" (سورۂ ہود: ع ۸)

"اے میری قوم، ناپ اور تول انصاف سے پورا کیا کرو اور لوگوں کی چیزیں کم نہ دیا کرو!"

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی امت کو یہ تعلیم دی:

"وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ ۔" (الرحمٰن: ع ۱)

"تم انصاف کے ساتھ وزن اور ناپ پورا کیا کرو اور ناپ کم نہ دیا کرو۔"

۱۴۔ حضرت موسیٰ ؑ نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ اے قوم، فرعون کے تعاقب سے گھبرائے کیوں جاتے ہو، تو:

"قَالَ كَلَّا ۚ اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ ۔" (الشعراء: ع ۴)

"(موسیٰ ؑ نے کہا) ہرگز ایسا نہ ہوگا، میرا پروردگار میرے ساتھ ہے۔"

پھر نبی ؐ کی معیت کا ذکر بھی فرمایا، ذرا شان ملاحظہ ہو:

"لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۔" (سورۂ توبہ: ع ۶)

"(آپ ؐ نے ابوبکر ؓ سے فرمایا کہ) خوف مت کر خدا ہمارے ساتھ ہے۔"

موسیٰ علیہ السلام نے مژدۂ نبوت پر شرح صدر کی درخواست کی تھی:

"قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ ۔" (سورۂ طٰہٰ: ع ۲)

"موسیٰ ؑ نے دعا کی "الٰہی میرا سینہ کھول دے!"

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بلا سوال ارشاد ہوا:

"اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۔" (الانشراح: ع ۱)

"کیا ہم نے آپ ؐ کا انشراحِ صدر نہیں فرمایا؟"

۱۵۔ حضرت ہارون علیہ السلام کی فصاحت لسانی کا ذکر قرآن مجید میں یوں ہے:

"وَاَخِيْ هٰرُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّيْ لِسَانًا ۔ الآیۃ" (قصص: ع ۴)

"میرا بھائی ہارون، جو مجھ سے زیادہ فصیح ہے۔"

اور نبی کریم ؐ کی فصاحت و بلاغت کے متعلق جملہ محاسن کو دو لفظوں میں مقید فرما دیا:

"سِحْرٌ يُؤْثَرُ"

"یہ محض جادو ہے جو پہلے لوگوں سے نقل چلا آیا ہے۔"

مقامِ غور ہے کہ کفارِ مکہ، رسولِ کریمؐ کی جادو بیانی کا اقرار کرتے ہیں اور تہ دل سے انھیں بھی علم ہے کہ آپؐ کی بات میں کشش اور تاثیر ہے۔ الغرض جادو بیان ہونا انتہائی فصاحت وبلاغت ہے۔ اکبر الٰہ آبادی کہتے ہیں۔

سمجھ میں صاف آجائے فصاحت اس کو کہتے ہیں
اثر ہو سننے والوں پر بلاغت اس کو کہتے ہیں!

۱۶۔ حضرات داؤد اور سلیمان علیہما السلام کے علم کے متعلق ارشاد ہوا:

"وَلَقَدْ آتَيْنَا دَاوُدَ وَسُلَيْمَانَ عِلْمًا" (النمل: ع ۲)

"ہم نے داؤدؑ اور سلیمانؑ کو علم دیا تھا۔"

اور نبی کریمؐ کے متعلق ایسا ارشاد ہے، جس میں تمام قسم کی چیزیں داخل ہیں:

"وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ" (النساء: ع ۱۷)

"آپؐ کو وہ باتیں سکھائی ہیں جو آپؐ نہیں جانتے تھے!"

حضرت داؤدؑ کی شان میں فرمایا:

"وَلَقَدْ آتَيْنَا دَاوُدَ مِنَّا فَضْلًا" (سبا: ع ۲)

"اور ہم نے حضرت داؤدؑ کو اپنے پاس سے فضل دیا تھا۔"

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں فرمایا:

"وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيمًا" (النساء: ع ۱۷)

"اور آپؐ پر خدا کا بڑا فضل ہے۔"

یہاں پر فضلِ عظیم کے ذکر سے آپؐ کی افضلیت ثابت ہوئی۔

حضرت داؤد علیہ السلام کی نسبت ارشاد ہوا:

"وَأَلَنَّا لَهُ الْحَدِيدَ" (السباء: ع ۲)

"اور ہم نے لوہے کو ان کے لیے نرم کر دیا۔"

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام میں وہ قوتِ روحانی ہے، جس نے دلوں کو نرم کر دیا، فرمایا:

"ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰی ذِكْرِ اللهِ" (سورۃ زمر: ع ۳)

"پھر ان کے چمڑے اور دل خدا کے ذکر کی طرف جھکتے ہیں (یعنی اُن کے جسم، ان کے قلب، ذکر اللہ کے لیے نرم ہو جاتے ہیں)"

مولانا حالی مرحوم نے کیا خوب لکھا ہے۔

ے پانی میں آگ کا لگانا دشوار بہتے ہوئے دریا کو پھیر لانا دشوار

دشوار تو ہے مگر نہ اتنا جتنا کسی بگڑی ہوئی قوم کا بنانا دشوار

چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دلوں کو مسخر کر لیا تھا۔

۱۷۔ حضرت سلیمانؑ کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

"وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ ۔ الاٰية" (سبا: ع ۲)

"اور ہم نے ہوا کو سلیمانؑ کے تابع کر دیا۔"

اسی طرح نبی کریمؐ کے حالات میں بیان کیا گیا:

"اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا ۔ الاٰية" (الاحزاب: ع ۲)

"جب لشکر تم پر چڑھ آئے تو ہم نے ان پر ہوا اور ان لشکروں کو بھیجا جن کو تم نے نہیں دیکھا"

۱۸۔ حضرت ایوبؑ کی خاص صفتِ صبر کے متعلق فرمایا:

"اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا" (ص: ع ۴)

"ہم نے انہیں صبر کرنے والا پایا۔"

اللہ نے اسی صفت کا ذکر نبی کریمؐ کے لیے بھی کیا ہے فرمایا:

"وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللهِ" (نحل: ع ۱۶)

"اور ہمیشہ آپؐ کا صبر اللہ کی عنایت سے ہے۔"

رسولِ کریمؐ کا صبر ایک مشہورِ عالم حقیقت ہے۔ چنانچہ عبداللہ بن رواحہ نے یہ شعر نبی کریمؐ کی شان میں کہا ہے:

ے رَسُوْلُ اللهِ مُصْطَبِرٌ كَرِيْمٌ بِاَمْرِ اللهِ يَنْطِقُ اِذْ يَقُوْلُ

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سراپا صبر ہیں اور اللہ کے حکم سے گویا ہوتے ہیں۔

اللہ پاک نے حضرت ایوبؑ کے لیے فرمایا:
"نِعْمَ الْعَبْدُ" (صٓ: ع۳)
مگر حضورؐ کے متعلق فرمایا:
"سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ۔ الآیۃ!" (بنی اسرائیل: ع۱)
"اللہ تعالیٰ تمام عیوب سے پاک ہے جس نے اپنے بندے محمدؐ کو راتوں رات سیر کرائی۔"
اور کمال ملاحظہ ہو کہ ضمیر کا جھگڑا ہی مٹا دیا اور براہِ راست نسبتِ عبدیت اپنی طرف کر لی۔ فرمایا:
"لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰہِ یَدْعُوْہُ" (جن: ع۱)
یعنی "جب اللہ کا بندہ کھڑا ہو کر اسے پکارتا ہے۔"
۱۹۔ حضرت زکریاؑ کی نسبت فرمایا:
"ذِکْرُ رَحْمَتِ رَبِّکَ عَبْدَہٗ زَکَرِیَّا" (مریم: ع۱)
"یہ آپؐ کے پروردگار کی رحمت کا ذکر ہے جو اس نے اپنے بندے زکریاؑ پر فرمائی۔"
نبی پاکؐ کے متعلق ارشاد ہوا:
"اِلَّا رَحْمَۃً مِّنْ رَّبِّکَ اِنَّ فَضْلَہٗ کَانَ عَلَیْکَ کَبِیْرًا۔"
(سورۂ بنی اسرائیل: ع۱۰)
"... یہ آپؐ کے پروردگار کی رحمت ہے، کچھ شک نہیں کہ آپؐ پر اس کا فضل بہت بڑا ہے۔"
رحمت اور فضلِ کبیر کا تذکرہ آپؐ کی رفعتِ شان کے لیے کافی ہے۔
۲۰۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام کی بابت ارشاد ہے:
"مُصَدِّقًا بِکَلِمَۃٍ مِّنَ اللّٰہِ۔ الآیۃ!" (آلِ عمران: ع۴)
"وہ اللہ کے حکم کی تصدیق کرنے والے ہیں۔"
قرآنِ کریم نے حضرت عیسیٰؑ کو اپنا کلمہ بنایا ہے اور حضرت یحییٰؑ کو مصدّق قرار دیا۔ کچھ شک نہیں کہ حضرت یحییٰؑ نے حضرت عیسیٰؑ کے قدومِ میمنت لزوم کی خبر لوگوں کو

مستقبل میں دی تھی۔ نبی کریمؐ کے متعلق یوں ارشاد ہوا:

"مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ - الآیۃ!" (البقرۃ: ع ۱۲)

یعنی "اپنے سے پہلوں کی تصدیق کرنے والے ہیں۔"

صرف مستقبل ہی نہیں ماضی کی بھی تصدیق کرنے والے!

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ نبی کریم فداہُ ابی واُمی نے تصدیقِ انبیاءؑ کے کام کو زیادہ وسعت کے ساتھ انجام دیا۔

۲۰۔ حضرت یحیٰؑ کو "سیّد" کہا گیا۔

نبی کریمؐ کو بھی اس عظیم خطاب سے نوازا: "یٰس! (اے سیّد)

یہ ترجمہ کتاب الشفاء میں حضرت جعفرؓ سے مروی ہے۔

۲۱۔ یحیٰ علیہ السلام کی شان میں فرمایا:

"وَحَنَانًا مِّن لَّدُنَّا - الآیۃ!" (مریم: ع ۱)

یعنی "خدا کی طرف سے نرم دل پاک طینت ہیں۔"

نبی کریمؐ کی شان میں ہے:

"فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنتَ لَهُمْ۔" (آلِ عمران: ع ۱۷)

یعنی "یہ خدا کی رحمت ہے کہ اس نے آپؐ کو نرم دل پایا۔"

۲۲۔ حضرت عیسیٰؑ کی بابت ارشاد ہے:

"وَآوَيْنَاهُمَا إِلَىٰ رَبْوَةٍ - الآیۃ!" (مومنون: ع ۳)

یعنی "ہم نے مریمؑ وابن مریمؑ کو ایک بلند ٹھکانا دیا۔"

اسی طرح عہدِ طفلی میں نبی کریمؐ کے لیے بھی فرمایا:

"أَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيمًا فَآوَىٰ؟" (سورۂ ضحیٰ)

کہ آپؐ دنیا میں یتیم ہو کر آئے پھر خدا نے آپؐ کو ٹھکانا دیا۔"

الغرض نبی کریمؐ کی ذات میں وہ تمام محاسن و فضائل بکمال موجود تھے جو تمام انبیاءؑ میں پائے جاتے تھے کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے

حسنِ یوسفؑ دمِ عیسیٰؑ یدِ بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری!

پروفیسر حافظ محمد سعید انجینئرنگ یونیورسٹی، لاہور

مقالات

شریعت اور فقہ میں فرق

شریعت صرف اور صرف کتاب و سنت ہے، اجتہاد (فقہ) کا دروازہ تاقیامت ہمارے نزدیک کھلا ہے، مگر مختلف فقہوں میں سے کسی کو نہ شریعت قرار دیا جا سکتا ہے اور نہ ہی شریعت کے نام پر اسے قبول کیا جا سکتا ہے۔

سینیٹ کے بعض ارکان نے اپنا دینی فریضہ ادا کرتے ہوئے نفاذِ شریعت کے نام سے ایک بل سینیٹ میں پیش کیا۔ لیکن اس بل میں شریعت کی تعریف ایسی کی گئی کہ جس سے بل متنازعہ بن گیا۔ چنانچہ اس بل کی دفعہ ۲ یوں ہے:

"شریعت کی تعریف:

اس ایکٹ میں شریعت سے مراد

ا۔ دین کا وہ خاص طریقہ ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے اپنے بندوں کے لیے مقرر کیا ہے۔

ب۔ شریعت کا اصل ماخذ قرآن پاک اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

ج۔ کوئی حکم یا ضابطہ جو اجماع اُمت سے ثابت اور ماخوذ ہو شریعت کا حکم متصور ہوگا۔

د۔ ایسے احکام جو امت کے مسلمہ اور مستند فقہاء مجتہدین نے قرآن پاک اور سنت رسول اللہ اور اجماع امت کے قیاس و اجتہاد کے ذریعہ مستنبط کر کے مدون کیے ہیں شریعت کے احکام متصور ہوں گے۔

غور کیا جائے تو بل میں شریعت کی تعریف کو اس طرح سے پیش کیا گیا ہے کہ بعض فقہی مسالک کے ذہنی تحفظات کو جگہ مل گئی ہے۔ چنانچہ دوسرے فقہی مسلک نے بل کو ہی اپنے خلاف سمجھ لیا اور مخالفت شروع کر دی۔ اسی طرح جدید طبقے نے یہ تاثر لیا

ہے کہ اس بل سے اجتہاد کے دروازے بند ہو جائیں گے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ بنیادی اختلافی مسئلے کو حل کیا جائے اور وہ ہے شریعت کی تعریف کا قضیہ۔ چنانچہ بل کی دفعہ ۲ کی شق ڈ میں شریعت کی جو تعریف کی گئی ہے وہ الفاظ نہایت مناسب ہیں، جن کی رو سے شریعت ان احکام اور طریقوں کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ نے خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کئے ہیں۔ قرآنِ مجید میں ہے:

"اے پیغمبرؐ، ہم نے آپؐ کو ایک شریعت پر چلایا ہے سو آپؐ اسی کا اتباع کریں اور ان لوگوں کے پیچھے نہ چلیں جو نہیں جانتے۔"

سورۃ مائدۃ میں ہے:

"آپؐ فیصلہ اس کے مطابق کریں جو اللہ تعالیٰ نے نازل کیا ہے اور لوگوں کی خواہشات پر نہ چلیں اور ڈرتے رہیں کہ کہیں لوگ آپؐ کو فتنے میں مبتلا نہ کریں اس بارے میں جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے۔"

اس مضمون کی متعدد آیات قرآنِ حکیم میں موجود ہیں، جن سے یہ واضح ہے کہ شریعت صرف منزل من اللہ یعنی وحی ہے۔ چنانچہ جو چیز اللہ کی طرف سے نہیں یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں وہ شریعت نہیں۔ اس مناسبت سے شریعت کا اطلاق صرف دو چیزوں پر ہوتا ہے کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ ان کے علاوہ جو کچھ بھی ہے اور شریعت بل کی تعریف کرتے ہوئے شق "ج" اور "د" میں جو کچھ پیش کیا گیا ہے، اس کی حیثیت شرعی تو ہو سکتی ہے لیکن اسے شریعت قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اجتہاد و قیاس، چاہے ایک عالم کا ہو یا اسے اجماعی حیثیت حاصل ہو، کا تعلق شریعت کے فہم سے ہے جسے اصطلاح میں فقہ کہتے ہیں۔ فقہاء ائمہ کے ہاں آراء کا اختلاف تھا اور اس کی گنجائش موجود ہے۔ امام شافعیؒ کی آراء ایک ہی مسئلے میں مختلف ملتی ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ اور ان کے شاگردوں کا متعدد مسائل میں اختلاف فقہ کی کتب میں موجود ہے۔ اس مناسبت سے متعدد فقہیں موجود ہیں، یعنی حنفی فقہ اور شافعی فقہ وغیرہ۔ لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ شریعتیں بھی متعدد ہیں۔ خود حنفی اور شافعی اور جعفری حضرات نے بھی کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ حنفی شریعت یا جعفری شریعت۔ بلکہ یہ بات مسلم ہے کہ شریعت صرف ایک ہے اور وہ ہے شریعت محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ اور فقہیں متعدد ہیں اور مختلف بھی۔ یہاں اس بات کا ازالہ بھی ہو جانا چاہیے

کہ بعض لوگ قرآن ہی کو ماخذ شریعت مانتے ہیں اور سنت کی اہمیت کے انکاری ہیں حالانکہ شریعت کی نسبت اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے تو اس میں قرآن کے ساتھ سنت بھی شامل ہے کیونکہ ان دونوں کا اصل ایک ہے یعنی وحی الٰہی۔

کتاب وسنت کے علاوہ اجتہاد وقیاس شرعی ضرورتیں ہیں جن کے بغیر چارہ نہیں۔ کیونکہ حالات اور واقعات زندگی ہر آن تغیر پذیر ہیں (لیکن اس کے ساتھ یہ عقیدہ رکھنا بھی لازمی ہے کہ شریعت غیر مبدل ہے، دائمی ہے اور قیامت تک کے لیے مکمل ہے) اس موقع پر اجتہاد کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ کسی طرح بھی ممکن نہیں کہ اجتہاد کے دروازے کو بند کیا جائے بلکہ یہ قیامت تک کے لیے کھلا ہے۔ علماء اور کتاب وسنت کے ماہرین آتے رہیں گے اور اجتہاد کے ذریعے ہر قسم کے حالات میں اُمت کی رہنمائی کرتے رہیں گے۔

جدید طبقے کے ہاں اجتہاد کے بارے میں جو غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں ان کا ازالہ بھی ضروری ہے اس سلسلے میں فی الحال اتنا کہنا کافی ہے کہ اجتہاد کتاب وسنت پر اضافے کا نام نہیں ہے۔ بلکہ اجتہاد سے مراد بدلے ہوئے اور جدید حالات میں کسی مسئلے کے بارے میں شریعت یعنی کتاب وسنت کا حکم معلوم کرنا ہے۔ یہ مجتہد کا کام ہے کہ کتاب وسنت کا کون سا حکم درپیش مسئلے پر لاگو ہوتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ حکم معلوم کرتے اور اس کے تعین میں غلطی ہو جائے۔ یہ انسانی کمزوری ہے۔ ہزار کوشش کے باوجود بھی غلطی کا امکان ہے اس لیے مجتہد کا اجتہاد اس کی رائے ہوتا ہے، اسے شریعت نہیں کہتے۔ متجددین یہ سمجھتے ہیں کہ اجتہاد سے شاید شریعت پر اضافے کی گنجائش مل جاتی ہے۔ یا یہ کہ حالات بدلنے سے شاید حکم بھی تبدیل ہو جاتا ہے، یہ سب نظریات قطعاً غلط ہیں اور الحاد وزندقہ یہیں سے پیدا ہوتے ہیں۔

فقہ کے بارے میں بھی ہمارے ہاں دو قسم کی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ ایک طبقہ وہ ہے جس کا ابھی ذکر کیا گیا ہے، انہیں فقہ سے چڑ ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ فقہاء کا علمی سرمایہ ہمارے لیے بے سود ہے بلکہ وہ اپنی ترقی پسندی کو قائم رکھنے کے لیے اسے دقیانوسیت قرار دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جدید دور کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے فقہی سرمایہ سے صرفِ نظر کر کے جدید اندازِ فکر اختیار کرنا چاہیے۔ کیونکہ جدید علوم، سائنسی دور کے مسائل

کو حل نہیں کر سکتے اور چاند پر پہنچنے والا انسان گھوڑے گدھے کی سواری کے زمانے میں واپس نہیں جا سکتا۔ اور دوسرا طبقہ جدیدیت کے برعکس تقلیدی نقطہ نظر کا حامل ہے۔ تجدد کے مقابلے میں اسے اتنا برا نہیں کہنا چاہیے۔ اگر ہمارے مقلدین بھائی متعصبانہ رویہ اختیار نہ کریں تو مسائل سلجھ سکتے ہیں۔ اگر ایک امام کی رائے پر ہی فتویٰ دیا جائے اور اسی کی رائے پر ہی اجتہاد کی بنیاد رکھی جائے تو اس سے نہ صرف فرقہ پیدا ہوتا ہے بلکہ اجتہاد اور فقہ جیسی اہم شرعی ضرورتوں کے بارے میں بھی غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں اور جدید طبقہ یہ سمجھنے پر مجبور ہوتا ہے کہ ان کارروائیوں سے اجتہاد کا دروازہ بند کیا جا رہا ہے۔

چنانچہ جدید و قدیم کے اس بُعد نے ایک بحرانی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ یہی بنیادی خلا ہے اور نفاذِ شریعت بل کی منظوری میں اصل رکاوٹ یہی ہو سکتی ہے۔ اعتدال کی راہ میں اس مسئلے کا حل ہے۔ جہاں تک فقہی علوم کے اور سلف کے علمی ورثے کا تعلق ہے، اس سے قطع تعلق ممکن نہیں۔ صحابہ کرامؓ سے لے کر محدثین و مفسرین اور فقہاء تک سب وہ لوگ ہیں جنہوں نے شریعت کو سمجھا اور اس پر عمل کیا اور شریعت کی تعبیر و توضیح میں نمایاں کردار ادا کیا۔ آج اگر پاکستان کی سپریم کورٹ میں پولینڈ کی عدالتوں کے فیصلوں کا حوالہ دیا جا سکتا ہے تو شریعت کے فہم میں متقدمین علماء و ائمہ مجتہدین کو کیوں نظر انداز کیا جائے؟ ہم سمجھتے ہیں کہ ان سب بزرگانِ دین سے استفادہ کیا جائے، خصوصاً وہ لوگ جنہیں خیر القرون کہا گیا ہے، انہیں نظر انداز کر کے شریعت کی تعبیر درست نہیں ہو سکتی۔ سلف سے ہٹ کر جو لوگ قانون سازی کے اختیارات اسمبلیوں کو دینا چاہتے ہیں، شاید وہ اس بات سے آگاہ نہیں کہ جدید مغربی افکار سے شریعت کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی جائے گی تو شریعت کا اس سے بڑا نقصان کوئی نہیں ہو سکتا۔

البتہ یہ ضروری ہے کہ کسی ایک امام کو خاص نہ کیا جائے، بلکہ اسلامی تاریخ کے تابناک علمی کارناموں کو ساری دنیا کے سامنے پیش کر کے ثابت کیا جائے کہ فقہاء و علماء کی جو کثرت اسلام کی خدمت کرتی رہی ہے اس کی کوئی مثال دنیا میں نہیں ملتی اور ہر جدید مسئلے کے بارے میں ہمیں سلف کی راہنمائی ملتی ہے۔ اس بحث کے خلاصے کے طور پر کہا جا سکتا ہے کہ شریعت کی تعریف اور تعبیر میں فرق کیا جائے۔ شریعت سے مراد تو کتاب و سنت ہی ہیں البتہ ان کے فہم و تعبیر کے لیے علماء و فقہاء سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جائے۔ ان میں سے کسی کے قیاس و اجتہاد کو شریعت نہ کہا جائے۔

چنانچہ شریعت بل میں اگر شریعت کی تعریف کے لیے شق ۱ پر اکتفاء کی جائے تو اس تعریف پر سب مسلمانوں کا اتفاق ہو سکتا ہے۔ کتاب و سنت کا یہ اعجاز ہے کہ مسلمان ہوتے ہوئے کوئی ان کے خلاف آواز نہیں اٹھا سکتا۔ جدید طبقے کے لوگ بھی اس سے منحرف نہیں ہیں۔ شیعہ اور سنی دونوں متفق ہیں۔

مسلمان گروہوں میں اختلاف اگرچہ بہت پرانا ہے لیکن قابلِ تعریف تو نہیں ہے اور نہ ہی پرانا ہونا اس کے لیے سندِ جواز پیدا کرتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کی اجازت نہیں دی بلکہ حضورؐ نے امت کے اس اختلاف کو، جس سے اُمت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں، ہلاکت قرار دیا ہے۔ بعض لوگ ایک حدیث پیش کرتے ہیں جس کا مفہوم یہ ہے کہ اُمت کا اختلاف رحمت ہے۔ اس حدیث کا کوئی اصل نہیں ہے۔ آج یہ وقت نہیں ہے کہ اختلافات کو اٹھایا جائے۔ کتاب و سنت کی مضبوط بنیاد جب ہمارے پاس موجود ہے تو اس پر سب کو متفق ہو جانا چاہیئے۔ علماء کے ۲۲ نکات اگر متفقہ ہو سکتے ہیں، قراردادِ مقاصد متفقہ طور پر پیش کی جا سکتی ہے۔ ۱۹۷۳ء کے آئین پر تمام جماعتیں متفق ہو سکتی ہیں، تو موجودہ نفاذِ شریعت بل میں اختلاف کو رفع کرنے کے لیے کتاب و سنت پر اتفاق کیوں نہیں ہو سکتا؟[1]

ہم سب کو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اگر نفاذِ شریعت کی تحریک ملک میں ناکام ہو گئی تو اس سے عام مسلمانوں میں سخت مایوسی پھیلے گی اور کمیونسٹ اسے اپنی فتح تصور کریں گے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ نویں ترمیمی بل کو کافی نہ سمجھا جائے اور شریعت بل کی منظوری کے لیے متحد ہو کر منظم طور پر زور ڈالا جائے اور علماء ان چیزوں کو پیشِ نظر رکھیں جن پر اُمت کا اتفاق ہے اور ان چیزوں کو چھوڑ دیں جن پر ان کا اختلاف ہے۔ اور یہ سمجھ لیں کہ کتاب و سنت کے شریعت ہونے اور ان کی پابندی کرنے پر سب متفق ہیں۔

---

[1] واضح رہے کہ ۳۰ راگست کو جملہ مکاتبِ فکر، شریعت کی اس تعریف کہ "وہ قرآن و سنت ہی ہے" پر متفق ہو چکے ہیں۔ (ادارہ)

مقالات

پروفیسر محمد ایوب
شعبہ علوم اسلامیہ انجینئرنگ یونیورسٹی۔ لاہور

اِسلام میں غلامی کا تصوّر

یورپ نے اسلام پر جو اعتراضات اور بہتان تراشیاں کی ہیں، ایک طویل کہانی اور دلخراش داستان ہے۔ اسلام سے اپنا پرانا بدلہ چکانے کے لیے مغربی مفکرین نے اپنا پورا زورِ قلم اسلام کو بدنام کرنے کے لیے وقف کر ڈالا۔ اپنی صدیوں کی بربریت اور ظلم کو چھپانے کے لیے انہوں نے اسلام کو ایک ایسے خونخوار مذہب کا نام دیا، جو اپنے پیروکاروں کو انسانیت کا خون بہا کر جنت کا وارث بننے کی تعلیم دیتا ہے۔ جو عورت کو مرد کے برابر حقوق نہیں دیتا اور اسے گھر کی چار دیواری میں بند کرنا اجرِ عظیم قرار دیتا ہے ——— جو قطع اعضاء کی وحشیانہ سزائیں سناتا اور غلامی کو جائز قرار دے کر انسانیت کی تذلیل و توہین کا مرتکب ہوتا ہے! ——— یہ اور اسی طرح کے بیسیوں لغو اعتراضات مغربی مفکرین نے اسلام پر کر کے اپنی ذہنی، فکری اور قلبی تسکین کا سامان مہیا کرنے کی ناکام کوششیں کی ہیں۔

دکھ کی بات یہ ہے کہ ہمارے وہ دانشور اور مفکرین، جو مغربی تہذیب سے مرعوبیت کا شکار ہیں، مغرب کے ان نظریات کو یوں قبول کر چکے ہیں کہ وحی آسمانی کو بھی ان کے ہاں اس قدر پذیرائی حاصل نہیں۔ چنانچہ ان کا یہ ایمان بن چکا ہے کہ مغرب سے ہر آنے والا نظریہ اور فلسفہ قبول کئے بغیر ان کے لیے کوئی چارۂ کار ہی نہیں۔ کیونکہ ان کے نزدیک یہ لوگ تحقیق کی ان وادیوں اور علم کی ان چوٹیوں کو سر کر چکے ہیں کہ جن کا تصور بھی دوسروں کے لیے محال ہے۔

اس احساسِ کمتری میں مبتلا انیسویں صدی کے وہ مؤرخ اور سکالرز ہیں جن کی ساری تعلیم کا منبع اور فکری جولانگاہ مغربی فلاسفرز کے افکار و نظریات ہیں۔ ان کی ذہنی، فکری پرورش اسی ماحول کی رہینِ منت ہے۔ انہوں نے اپنی تاریخ، تہذیب اور تمدن

کا مطالعہ انہی کی لکھی ہوئی کتابوں سے کیا، اور اپنے اسلاف کی زندگیوں کا نمونہ انہی کی مرتب کی ہوئی تاریخوں میں، مغربی تہذیب کے عشق کی رنگین عینک لگا کر دیکھا ــــ وہ یہودی اور عیسائی مفکرین، جو طلوعِ اسلام سے لے کر آج تک اپنی اسلام دشمنی کو نہیں بھول سکے تھے اور یہ عداوت ان کے خمیر میں گندھی اور رچی بسی ہوئی تھی، انہوں نے اسلام کو بدنام کرنے کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ مسلمانوں کے زوال کے بعد ان لوگوں نے تحقیق کے دلکش نام پر اسلامی تاریخ و تہذیب کو بھینگی آنکھ کے ساتھ دیکھنا اور کھنگالنا شروع کیا اور اپنی ان کج بینیوں کو اپنی سیاسی قوت کی بنیاد پر تمام مفتوحہ اور مقبوضہ ممالک میں پھیلا دیا ــــ یورپ کو اس سلسلہ میں مکمل کامیابی حاصل ہوئی اور مغلوب اقوام نے "اَلنَّاسُ عَلٰى دِيْنِ مُلُوْكِهِمْ" کی تصویر پیش کرتے ہوئے بغیر کسی تحقیق اور غور و خوض کے ان کی ہرزہ سرائیوں کو قبول کر لیا۔

چالاک اور مکار اقوام کا یہی وطیرہ اور دستور ہوتا ہے کہ جب سیاسی غلبہ حاصل کر لیتی ہیں تو مغلوب اقوام کے ذہنوں کو مسخر کرنے کے لیے اور ان پر اپنی گرفت کو مضبوط رکھنے کے لیے ان کی تاریخ کو مسخ کر دیتی ہیں ــــ تاریخ، جس کی مثال ایک صاف اور شفاف آئینہ کی ہوتی ہے اور جس میں قومیں اپنے صحیح خد و خال کو پہچانتی ہیں، اپنے ماضی کو پڑھ کر اپنے حال کو سنوارتی اور مستقبل کی تدبیر کرتی ہیں، جب اس آئینہ ہی کو خراشوں سے بھر دیا جائے تو اس میں اپنا چہرہ دیکھنے والوں کو اپنے آپ سے نفرت ہونے لگتی اور خوف آنے لگتا ہے۔ دنیائے اسلام میں اور خصوصاً برِصغیر میں انگریزوں نے ہمارے ساتھ یہی کچھ کیا۔ چنانچہ ہمارے اسلاف اور بزرگوں پر وہ کیچڑ اچھالا گیا کہ دیانت و اخلاق کی تمام حدود کو پامال کر دیا گیا اور ہم اسی آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھنے لگے!

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم، جو بھٹکی ہوئی دنیا کو راہِ ہدایت دکھانے کے لیے تشریف لائے تھے، جنھوں نے اس کراہتی اور سسکتی ہوئی انسانیت کو فضول، بیہودہ رسوم و رواج کی بوجھل زنجیروں سے آزاد کیا، جو "وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ" کا مصداق تھے، جنہوں نے انسانیت کو محبت، اخوت اور مساوات کا درس دیا۔ جو اس جہان کے لیے رحمت بن کر آئے اور جو معلمِ اول اور حکیم اعظم تھے، ان پر طرح طرح کے الزامات لگائے گئے ــــ ہمارے اسلاف کو چور، ڈاکو اور لٹیرے

کہا گیا۔ اسلامی تاریخ کو انسانی خون سے رنگین گردانا گیا، مسلم سکالرز اور علماء کو جاہل کے نام سے پکارا گیا اور اس پر ہزاروں صفحات سیاہ کئے گئے۔ بایں ہمہ اپنے محقق اور منصف مزاج مؤرخ ہونے کا ڈھنڈھورا بھی پیٹا گیا —— ایسی بے شمار کتابیں آج بھی بازار میں دستیاب ہیں۔

انگریزی سکولوں میں آج وہ کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، جن میں " MY DOG - TIPO " کے الفاظ پائے جاتے ہیں۔ ٹیپو سلطان کو ذلیل کرنے کے لیے کتوں کے نام ٹیپو رکھے گئے اور سادہ لوح مسلمانوں کا اس کا احساس تک نہیں۔ بہرحال اس سیاسی زوال نے مسلمانوں کے علمی اور فکری سوتوں کو خشک کر دیا۔ غلامانہ ذہنیت کے حامل مسلمان غیروں کے فکری، علمی اور تہذیبی حملوں کے جواب کی سکت نہ پاتے ہوئے ان کی ہاں میں ہاں ملانے پر مجبور ہو گئے اور آج تک یہ حملے تہذیب اسلامی کی عمارت کی بنیادوں کو کھوکھلا کرنے کے لیے کئے جا رہے ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ انیسویں صدی میں ان حملوں سے بچنے کے لیے اُمت نے ایک کروٹ لی ہے، لیکن ایک شعلہ بن کر پھر سے پوری دنیا کو منور کرنے کا فرض اس اُمت کے ذمے ابھی باقی ہے۔ کیونکہ یہ اسی مقصد کے لیے پیدا کئے گئے ہیں۔ "کُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ" کی صدا ہر وقت ان کے کانوں سے ٹکرا رہی ہے۔ کسی صلاح الدین ایوبی اور محمد بن قاسم کی تلاش میں یہ تاریخ سرگرداں ہے۔ اللہ کرے وہ اُمتِ مسلمہ کو میسر آ جائیں تو اُمت اپنی راہ پر چل پڑے اور دنیا میں پھر ایک مرتبہ اسلام کا غلغلہ بپا ہو —— اقبال نے کہا تھا ؎

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی!

مستشرقین نے اسلام پر جن اعتراضات سے اسلام کے نام لیواؤں کے ناپختہ ذہنوں کو مسموم کرنے اور تہذیبِ اسلامی کے رخِ زیبا کو داغدار کرنے کی مذموم کوشش کی ہے، ان میں ایک اہم اعتراض "غلامی کا مسئلہ" بھی ہے۔ جس پر آج تک اسلام کو مطعون کیا جاتا رہا ہے، کہ "یہ بھی کوئی مذہب ہے جس نے انسانوں کی خرید و فروخت کو جائز رکھا ہے؟" —— "اس سے بڑھ کر انسانیت کی اور تذلیل کیا ہو سکتی ہے؟" —— "مسلمانوں نے اپنی جنسی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے پوری دنیا کی حسین ترین

دوشیزاؤں کو باندیاں بنایا۔ اور آزادی کی نعمتِ عظمیٰ سے محروم کیا —— وغیرہ وغیرہ!

کیا یہ اعتراضات صحیح ہیں اور اسلام میں غلامی کا یہی تصور ہے۔ ذیل میں ہم انہی اعتراضات کا ایک محققانہ جائزہ پیش کرتے ہیں۔

غلامی کے بارے میں اعتراضات:

۱۔ کمیونسٹ اکثر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اگر اسلام زندگی کے تمام ادوار کے لیے موزوں اور ان سے ہم آہنگ ہوتا تو وہ انسانوں کو غلام بنانے کی اجازت نہ دیتا اور نہ ہی غلامی کو برداشت کرتا۔ چنانچہ اسلام میں غلامی کے مسئلے کا پایا جانا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ یہ دین تاریخ کے ایک خاص دور کے لیے تھا اب اس کی ضرورت نہیں [۱]

۲۔ جے جے پول اپنی کتاب "سٹڈیز ان محمڈنزم" میں لکھتا ہے کہ:

"اسلامی ممالک میں غلام اتنے نہیں تھے جتنی باندیاں ہیں۔ مسلمانوں کے شہروں میں جو غلامی کا رواج پایا جاتا ہے، تو اس کا سبب یہ ہے کہ قرآن نے انہیں اس کی اجازت دی ہے کہ وہ گرفتار ہونے والی عورتوں کو باندیاں بنا کر رکھیں اور ان کے ساتھ ہمبستری کریں۔ ایک منکوحہ بیوی کے ساتھ کتنی ہی باندیوں کے اضافہ کی اجازت نے مسلمانوں میں پھیلا ہوا بدی کے صرف دروازے ہی نہیں کھولے، بلکہ غلاموں کی گردنوں میں لوہے کی ایسی زنجیریں ڈال دی ہیں، جنہوں نے غلامی کے رواج کو اسلامی ممالک میں پسندیدہ بنا دیا ہے۔" [۲]

۳۔ موئر اپنی کتاب "LIFE OF MOHAMMAD" میں لکھتا ہے:

"جہاں تک مسلمان آقاؤں کی سطوت کے تحت باندیوں کے ہونے کا تعلق ہے، انسانی تحقیر و تذلیل کا کوئی تصور اس سے زیادہ بھیانک نہیں ہو

---

[۱] اسلام اور جدید ذہن کے شبہات ص ۵۴

[۲] اسلام میں غلامی کی حقیقت ص ۱۱

سکتا۔ باندیوں کے ساتھ حقیر مخلوق کا سا معاملہ کیا جاتا۔ جب شادی کے قابل ہوتی تھیں تو انہیں شادی کے حقوق سے محروم کر دیا جاتا۔"

۴۔ یہی مصنف دوسری جگہ لکھتا ہے:

"عورتوں کی غلامی، باندیوں کے ساتھ ہمبستری کرنے کی ایک شرط ہے۔ لہٰذا مسلمان کبھی اپنی خوشی سے اسے ختم نہیں کریں گے۔" (صفحہ ۳۴)

۵۔ "غلامی کی تعلیم اسلام کے عین مطابق ہے۔ لیکن مذہبِ عیسوی کو غلامی سے نفرت ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے غلامی میں اصلاح کی، لیکن اس میں بھی شبہ نہیں کہ شارع عرب کا منشاء غلامی کو ہمیشہ رکھنے کا تھا۔" [1]

اسلام کو بدنام کرنے کے لیے عیسائی مصنفین اکثر یہ بات اپنی کتابوں میں لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کو ملک ملک کی حسین دوشیزاؤں سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملتا تھا اسی لیے انہوں نے غلامی کے رواج کو باقی رکھا۔

علاوہ ازیں اسی طرح کے مزید اعتراضات، جو صرف غیروں کی طرف سے نہیں بلکہ ان اپنوں کی طرف سے بھی ہیں جنہیں غیروں کی آشیرباد حاصل ہے، درج ذیل ہیں:

۱۔ ایک انسان کی اس سے زیادہ توہین کیا ہو سکتی ہے کہ اسے ڈھور ڈنگروں کی طرح بیچا جائے، خریدا جائے اور ہبہ کیا جائے؟

۲۔ غلام کی کوئی ملکیت نہ ہو اور وہ گویا صرف دوسروں کی خدمت اور تکلیفیں سہنے کے لیے دنیا میں آئے ہیں۔

۳۔ یہ چیز کتنی بھیانک اور بری ہے کہ ایک عورت محاذ پر سے پکڑی جائے اور اس کی خواہش کے برعکس اسے اپنی خواہشاتِ نفسانی کا تختۂ مشق بنایا جائے اور کوئی نکاح کی صورت بھی نہ ہو؟

۴۔ جو لوگ جنگ میں گرفتار ہوتے ہیں، حقیقت میں وہ اس حکومت کے مہمان کی حیثیت میں ہوتے ہیں۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ انہیں مجاہدین میں تقسیم کر دیا جائے؟

---

[1] اسلام میں غلامی کی حقیقت ص ۱۲۔

غلامی کی ابتداء اور تاریخی پس منظر:

اس سے پہلے کہ ہم مندرجہ بالا اعتراضات کا جائزہ لیں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وضاحت کر دی جائے، غلامی کی ابتدا کیسے ہوئی ـــــ کیا اسلام غلامی کا ذمہ دار ہے یا غلامی اتنی ہی پرانی ہے، جتنی کہ یہ کائنات خود پرانی ہے؟ ـــــ سید امیر علی لکھتے ہیں:

"The practice of salavery is co-evil with' human existance. Historically its traces are visible in every age and in every nation."

یعنی جب سے نسل انسانی وجود میں آئی ہے، غلامی بھی اس کے ساتھ موجود تھی۔ تاریخی طور پر ہر قوم اور ہر زمانے میں اس کے نشانات ملتے ہیں۔ یہودی۔ عیسائی، رومی اور پرانی جرمن اقوام میں دونوں طرح کی غلامی موجود تھی۔

غلام اور لونڈی کا سب سے بڑا ذریعہ جنگیں تھیں، جن میں فاتح قوم مفتوح قوم کے لوگوں کو غلام اور باندیاں بنا لیتی تھی۔ اس لیے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں ہے کہ جب سے دنیا میں جنگ کا وجود پایا جاتا ہے، اسی وقت سے غلامی بھی موجود ہے۔

نیبور نے یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ:

"ابتداء میں انسان کو جانور پالنے کی عادت تھی۔ اس عادت نے بڑھتے بڑھتے انسانوں کو پالنے کی عادت اور شکل اختیار کر لی اور اس کو غلامی کہا جانے لگا۔" (انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس ص ۵۹۶)

بہر حال تاریخی پس منظر میں جب ہم غلامی کو دیکھتے ہیں تو یہ تمام قدیم مذاہب اور اقوام میں پائی جاتی ہے۔

یہودیت میں غلامی کا وجود:

سفر الخروج بحوالہ "اسلام میں غلامی کی حقیقت" ص ۳۴ پر ہے کہ:

یہودی شریعت میں تین صورتوں میں ایک شخص دوسرے کو غلام بنا سکتا تھا:

۱۔ کوئی شخص کسی کا قرض ادا نہ کر سکے، تو قرض ادا کر دینے والے کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ مقروض کو غلام بنا لے۔

۲۔ کسی شخص نے چوری کی اور اب وہ مال واپس نہیں کر سکتا، تو مال کے مالک کو حق تھا کہ وہ چور کو کسی دوسرے شخص کے ہاتھ فروخت کر دے اور پیسے ادا کرنے والا چور کو غلام بنا لے۔

۳۔ والدین اپنی اولاد کو کسی کے ہاتھ بیچ ڈالیں۔

اس لیے اکثر یہودی، غلاموں کی تجارت کا کاروبار کرتے تھے۔ البتہ یہودی کتابوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے ہاں غلاموں کے حقوق باقی قوموں سے زیادہ تھے۔

عیسائیت میں غلامی:

"انجیل میں غلامی کی مذمت کہیں نہیں کی گئی" [1]

مسٹر ایل۔ ڈی ہاگیٹ لکھتا ہے کہ:

"ہمارے حضرت مسیحؑ نے غلامی ایسی وحشیانہ رسم کی مذمت کیوں نہیں کی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ،

۱۔ ہمارے آقا نے اپنی تعلیمات ایسے طریقہ سے پیش کی ہیں جو ہر زمانہ کے سیاسی حالات کے ماتحت قابلِ عمل ہوں۔

۲۔ یک لخت غلامی کے رواج کا خاتمہ کر دیتے اور اس کے لیے کوشش کرتے سے روحانی سوسائٹی کے نظامِ معاشرت کو صدمۂ عظیم پہنچتا تھا۔

۳۔ گرجا کا ابتدائی عہد اس امید پر تھا کہ حضرت عیسیٰؑ پھر دوبارہ جلد تشریف لائیں گے۔ اس بناء پر غلامی جیسی مادی چیز پر کوئی توجہ نہ دی گئی" [2]

عیسائیوں کے ہاں غلامی کی مذہبًا اجازت تھی اور یورپ والوں نے افریقہ کے سیاہ فام لوگ اس کثیر تعداد میں غلام بنائے کہ بعض قوموں کے نام و نشان تک مٹ گئے۔

---

[1] انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس۔ [2] ایضاً بحوالہ اسلام میں غلامی کی حقیقت۔

بازاروں میں غلاموں کی کھلم کھلا تجارت ہوتی اور اسی مقصد کے لیے مستقل بازار اور منڈیاں قائم تھیں۔

یورپ میں غلام جس کس مپرسی کی حالت میں زندگی بسر کرتے تھے، اس کا پورا نقشہ مسٹر سی۔پی۔ اسکاٹ ان الفاظ میں کھینچتا ہے:

"یہ غریب باربردار جانوروں کی فہرست میں شامل تھے اور ان کی انہی جیسی قدر و قیمت تھی۔ ان کو وہ تمام سختیاں اٹھانی پڑتیں جو طمع اور خوئے بد اختراع کر سکتی تھی۔ صرف یہی نہیں کہ وہ اپنے جاگیرداروں کے جبر و ظلم کو سہتے تھے، بلکہ اگر کوئی جاگیر کسی دوسرے کو منتقل ہوتی تو دستاویزات میں ان کا نام بھی شامل ہوتا۔ کیونکہ قانون نافذ الوقت کے مطابق ان کو جاگیر کا حصہ سمجھا جاتا تھا۔ جیسے اینٹ، پتھر، درخت اور جھاڑیاں وغیرہ۔ جاگیرداران سے سارا دن کام لیتے اور جہاں جانور باندھے جاتے تھے وہیں ان کا مقام ہوتا۔ ان کی گردن میں دھات کا طوق پڑا رہتا اور اس پر ان کے آقا کا نام کندہ ہوتا۔ انہیں کوئی حقوق حاصل نہیں تھے۔ اس طرح وہ اسی زمین کی مٹی ہو جاتے جس میں وہ کام کرتے تھے۔ اور موت ہی اگر انہیں اس مصیبت سے رہائی دلاتی تھی۔ بیکسی اور جانکاہی کی کوئی مثال اور انسانی ظلم و ستم کی کوئی داستان دنیا بھر میں ایسی نہیں ملتی جیسا کہ قرون متوسطہ میں غلاموں کی تھی ـــــ غلاموں کے خاندانوں کی عورتوں کی عزت اور عصمت بالکل آقاؤں کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔"[۱]

جیسا کہ میں نے عرض کیا، دنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں تھی جس میں غلامی کی بدترین شکلیں موجود نہیں تھیں۔ اہلِ فارس، اہلِ چین اور یونان و مصر میں غلام اپنی زندگی کو آہوں اور سسکیوں کے عالم میں گذار رہے تھے۔

اہلِ روم میں غلامی کی صورت:

غلامی کی تاریخ میں عہدِ روما بہت بدنام اور غلاموں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑنے

---

[۱] اخبار الاندلس، ج ۳ ص ۲۲۳ - ص ۲۲۶

میں بہت مشہور اور مذموم ہے۔ صرف اس موضوع پر بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اس سلسلہ میں مسٹر آر۔ ایچ بارد کی لکھی ہوئی کتاب۔ " SLAVERY IN THE ROMAN EMPPRE" ۔ بہت قیمتی معلومات کا ذخیرہ ہے۔[1]

رومیوں کے عہد میں غلاموں کو انسان نہیں سمجھا جاتا تھا، بلکہ محض جنسِ تجارت خیال کیا جاتا تھا۔ انھیں کسی قسم کے حقوق حاصل نہیں تھے۔ مگر یہ کٹھن فرائض اور ذمہ داریوں سے گرانبار تھے۔ یہ غلام کہاں سے آتے تھے؟ ان کا سب سے بڑا ذریعہ جنگیں تھیں، جو کسی بڑے نصب العین کے لیے نہیں لڑی جاتی تھیں، بلکہ دوسروں کو غلام بنانے کے لیے برپا کی جاتی تھیں۔ چنانچہ ان جنگوں میں جو لوگ پکڑے جاتے وہ غلام بنا لیے جاتے۔

ان جنگوں کا مقصد اہلِ روما کے لیے عیش و عشرت کے سامان، ٹھنڈے اور گرم حمام، ملبوساتِ فاخرہ۔ لذیذ کھانے اور دوسرے لذائذِ حیات فراہم کرنا تھا۔[2]

جنگوں میں جو لوگ گرفتار ہوتے، انہیں روما کے بازاروں میں بہت کم قیمت پر فروخت کر دیا جاتا۔ وہ لڑکے اور لڑکیوں کو چرا لاتے اور غلام باندیاں بنا کر بیچ دیتے۔ ان کا عام دستور تھا کہ جس غلام کو بیچنا ہوتا اسے پتھر کی ایک چٹان پر کھڑا کر دیتے تاکہ ہر گاہک اسے دیکھ سکے۔[3]

غلاموں کو سزائیں اور رومی زندگی کی بھیانک تصویر:

غلاموں کو سزا دینے کے بدترین طریقے رائج تھے۔ اگر کسی غلام سے ادنیٰ سا جرم سرزد ہو جاتا تو اس کی کمر کے ساتھ ایک بھاری پتھر باندھ دیا جاتا اور اسی صورت میں اسے کھیتوں میں کام کرنے کے لیے کہا جاتا۔ بطورِ سزا غلاموں کو الٹا لٹکا دیا جاتا اور بڑی وزنی چیزیں ان کے جسم کے ساتھ باندھ دی جاتیں۔ اور اتنا مارا جاتا کہ وہ بیچارے زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتے۔[4]

رومی استعمار کی حرص و ہوس کے لیے سامانِ عیش و عشرت فراہم کرنے کی خاطر

---

[1] اسلام میں غلامی کی حقیقت ص ۴۲ بحوالہ۔ الرق فی الاسلام ص ۳۲۔ [2] اسلام اور جدید ذہن کے شبہات ص ۵۰۔ [3] اسلام میں غلامی کی حقیقت ص ۴۳۔ [4] ایضاً

غلاموں کے ریوڑ دن بھر کھیتوں میں جُتتے رہتے۔ اس کے باوجود ان کو پیٹ بھر کر کھانے کو نصیب نہیں ہوتا تھا، بلکہ صرف اتنا دیا جاتا کہ جس سے ان کا رشتۂ جسم وروح برقرار رہتا۔ بے جان درختوں اور وحشی درندوں سے بھی ان کی حالت گئی گزری تھی۔ دن کے وقت ان کو بیڑیاں پہنا دی جاتی تھیں تاکہ وہ بھاگ نہ جائیں۔ ان کی پیٹھوں پر بے تحاشا کوڑے برسائے جاتے۔ کیونکہ آقا اور مقامی کارکن انہیں اذیت پہنچانے میں لذت محسوس کرتے تھے۔ شام کو جب کام ختم ہوتا تو دس دس، بچاس بچاس کی ٹکڑیوں میں بانٹ کر مویشیوں کی طرح انہیں غلیظ، بدبودار، چوہوں اور کیڑے مکوڑوں سے پٹے ہوئے باڑوں میں بند کر دیا جاتا۔ ؎۱

ایک وحشیانہ کھیل:

آقاؤں کی ضیافتِ طبع کے لیے کچھ غلاموں کو تلواریں اور نیزے دے کر اکھاڑے میں دھکیل دیا جاتا۔ اکھاڑے کے چاروں طرف تماشائیوں کی نشستیں بنی ہوتی تھیں، جن پر ان غلاموں کے آقا اور بعض اوقات خود شاہِ روم رونق افروز ہوتا۔ کھیل شروع ہوتا، غلام تلواروں اور نیزوں سے ایک دوسرے پر پل پڑتے یہاں تک کہ ایک دوسرے کا قیمہ بن جاتا۔ جو خوش قسمت بچ جاتے وہ فاتح سمجھے جاتے، ان کے لیے تالیاں پیٹی جاتیں اور خوشی کے نعروں اور قہقہوں سے ان کا استقبال کیا جاتا۔ ؎۲

ٹیٹوس جو نسلِ انسانی کا دُلارا (Darling of the Human Race) کہلاتا ہے، اس نے ایک دفعہ ۵ ہزار درندوں کو پکڑوایا اور کئی ہزار یہودی قیدیوں کو ان کے ساتھ ایک احاطہ میں چھوڑ دیا۔ ٹراجان کے کھیلوں میں گیارہ ہزار درندے اور دس ہزار آدمی بیک وقت لڑائے جاتے تھے۔ کلاڈیوس نے ایک دفعہ ایک جنگی کھیل میں ۱۹ ہزار آدمیوں کو تلواریں دے کر ایک دوسرے سے لڑا دیا۔ قیصر اگسٹس نے اپنی وصیت کے ساتھ جو تحریر منسلک کی تھی، اس میں لکھتا ہے کہ "میں نے ۸ ہزار شمشیر زنوں اور ۳۵۱۰ جانوروں کے کھیل دیکھے ہیں۔" یہ سب تفریحات جنگی قیدیوں کے دم قدم

؎۱ اسلام اور جدید ذہن کے شبہات ص۵۸۔ ؎۲ اسلام اور جدید ذہن کے شبہات ص۶۰

سے چل رہی تھیں۔ ؎۱

رومی قانون میں غلاموں کے لیے اس قدر سخت قوانین تھے کہ اگر کوئی غلام اپنے آقا پر دست درازی کرتا تو اس کو، اور بعض اوقات اس کے پورے خاندان کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا۔ ؎۲

۶۱۱ء میں جب ہرقل کی تخت نشینی کے تھوڑا عرصہ بعد اس کی بیوی پوڈوکیسیا کا انتقال ہو گیا اور اس کا جنازہ قبرستان کی طرف چلا تو اتفاق سے ایک لونڈی نے، جو ساتھ تھی، زمین پر تھوک دیا۔ اس قصور پر اسے گرفتار کیا گیا اور اس کے قتل کا حکم دے دیا گیا۔ ؎۳

ایران کی حالت:

روم کی طرح ایران میں بھی اسیرانِ جنگ کے لیے کسی قسم کی کوئی رعایت نہ تھی۔ معمولی قیدی تو درکنار، خود قیصرِ روم والیریان جب شاہ پور اول کے ہاتھوں قید ہوا تو اسے زنجیروں سے باندھ کر شہر میں گشت کرایا گیا۔ عمر بھر اس سے غلاموں کی طرح خدمت لی گئی اور مرنے کے بعد اس کی کھال کھنچوا کر اس میں بھس بھروا دیا گیا۔ ؎۴

شاہ پور ذوالاکتاف کا واقعہ مشہور ہے کہ بحرین اور الحساء کے عرب اسیرانِ جنگ سے انتقام لینے کے لیے اس نے حکم دیا تھا کہ ان کے شانوں میں سوراخ کر کے ان کے اندر رسیاں پروئی جائیں اور سب کو ملا کر باندھ دیا جائے۔ اسی بنا پر تاریخ نے ان کو "ذوالاکتاف" کے نام سے یاد رکھا ہے۔ ؎۵

الغرض غلام کی زندگی اور موت اس کے آقا پر منحصر تھی۔ وہ چاہتا تو اسے زندگی کی کوئی آسائش دیتا یا جانوروں سے بھی بدتر زندگی گزارنے پر مجبور کر دیتا، جیسا کہ آپ نے اوپر اقتباسات ملاحظہ فرمائے۔ پورے معاشرے اور قوم کی ذہنی غذا اسی میں تھی کہ وہ غلاموں کی زندگیوں کو اجیرن بنائے رکھے۔ ان کے جسموں کو گرم لوہے سے داغنا، کسی جرم پر ان کے کان کاٹ دینا اور فرار ہو جانے پر انہیں قتل کر دینا، روزمرہ کا مشغلہ تھا ـــــ غلاموں کے سلسلہ میں تقریباً یہی صورتِ حال تمام قوموں میں موجود تھی۔

(جاری ہے)

؎۱ الجہاد فی الاسلام ص ۲۱۴۔

؎۲ CONSTANTINE THE GREAT -P.57 } بحوالہ الجہاد فی الاسلام ص ۲۱۴

؎۳ Byzantine Empire-P.99

؎۴ ؎۵ SKYES VOL.1 ، بحوالہ الجہاد فی الاسلام ص ۲۱۵

تحقیق و تنقید

مولانا محمد رمضان سلفی

قسط ۲ (آخری)

منکرینِ حدیث کی عربی زبان سے ناواقفی

"طلوعِ اسلام" نے اس مقام پر سیبویہ کا قول بڑے فخر سے نقل کیا ہے، حالانکہ سیبویہ کے ہاں اس عطف کی ممانعت کی دلیل بڑی کمزور ہے اور جستجو کے بعد اس کے ضعف میں کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہتا ـــــــ ہم چاہتے ہیں کہ اس علت کو نقل کیا جائے، جس کی بناء پر سیبویہ نے اس عطف کی ممانعت کا قول اختیار کیا ہے، اور پھر اس علت کی کمزوری کو واضح کیا جائے۔

یہ علت تفسیر قرطبی میں ہی اس طرح منقول ہے:

"وَقَالَ سِيْبَوَيْهِ: لَمْ يُعْطَفْ عَلَى الضَّمِيْرِ الْمَخْفُوْضِ لِاَنَّهٗ بِمَنْزِلَةِ التَّنْوِيْنِ وَالتَّنْوِيْنُ لَا يُعْطَفُ عَلَيْهِ"

(الجامع لاحکام القرآن جلد ۳ صـ۱۵۷۳)

یعنی ضمیر مجرور چونکہ تنوین کے مشابہ ہے۔ اور تنوین پر کسی اسم وغیرہ کا عطف نہیں ڈالا جا سکتا، لہٰذا ضمیر مجرور پر بھی عطف نہیں ڈالنا چاہیئے۔

لیکن تفسیر البحر المحیط وغیرہ میں سیبویہ کی بیان کردہ اس علت کی تردید یوں کی گئی ہے کہ:

"وَاَمَّا الْقِيَاسُ فَهُوَ اَنَّهٗ كَمَا يَجُوْزُ اَنْ يُّبْدَلَ مِنْهُ وَيُؤَكَّدَ، مِنْ غَيْرِ اِعَادَةِ جَارٍ كَذٰلِكَ يَجُوْزُ اَنْ يُّعْطَفَ عَلَيْهِ مِنْ غَيْرِ اِعَادَةِ جَارٍ"

(البحر المحیط ۲/۱۴۸)

اگر ضمیر مجرور پر تنوین کی مشابہت کی وجہ سے عطف نہیں ڈالا جا سکتا، تو پھر اس سے بدل اور تاکید لانا بھی ممنوع ہونا چاہیئے، کیونکہ تنوین سے بدل اور تاکید نہیں آسکتے، حالانکہ

بالاتفاق ضمیر مجرور سے بدل آسکتا ہے، اور اس کی تاکید لائی جاسکتی ہے، جبکہ عطف بھی تاکید اور بدل کی طرح توابع میں داخل ہے، تو ان میں تفریق کرنا، تفریق بین المماثلین ہے جو کہ ناجائز ہے۔

تفسیر قرطبی میں ہی اس عطف کی ممانعت کی ایک دوسری علت، جو مازنی سے نقل کی گئی ہے، وہ بھی قابل تسلیم نہیں ــــ علت بمع جواب ملاحظہ ہو:

" وَقَالَ الزَّجَّاجُ عَنِ الْمَازِنِيِّ : لِأَنَّ الْمَعْطُوفَ ، وَ الْمَعْطُوفَ عَلَيْهِ شَرِيْكَانِ ، يَحُلُّ كُلُّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مَحَلَّ صَاحِبِهٖ فَكَمَا لَا يَجُوْزُ مَرَرْتُ بِزَيْدٍ وَكَ ، كَذٰلِكَ لَا يَجُوْزُ مَرَرْتُ بِكَ وَزَيْدٍ۔

(الجامع لاحکام القرآن ۳/۳/۱۵۷)

یعنی دو اسموں میں سے ایک کے دوسرے پر عطف کے لیے یہ شرط ہے کہ ان میں ہر ایک دوسرے کی جگہ پر رکھا جاسکتا ہو، جیسے " مَرَرْتُ بِزَيْدٍ وَّعَمْرٍو " میں " مَرَرْتُ بِعَمْرٍو وَّزَيْدٍ " کہا جاسکتا ہے، لیکن ضمیر مجرور پر عطف کی صورت میں اس طرح قلب مکانی نہیں کی جاسکتی، لہٰذا جب " مَرَرْتُ بِزَيْدٍ وَكَ " جائز نہیں تو " مَرَرْتُ بِكَ وَزَيْدٍ " حرفِ جر دوہرائے بغیر، بھی جائز نہیں ہونا چاہیئے۔

اس دوسری علت کی تردید کرتے ہوئے علامہ جمال الدین طائی فرماتے ہیں:

" يَدُلُّ عَلٰى ضُعْفِهَا أَنَّهٗ لَوْ كَانَ حُلُوْلُ كُلِّ وَاحِدٍ مِّنَ الْمَعْطُوْفِ وَالْمَعْطُوْفِ عَلَيْهِ ــ يَعْنِيْ مَحَلَّ الْاٰخَرِ ــ شَرْطًا فِيْ صِحَّةِ الْعَطْفِ لَمْ يَجُزْ : رُبَّ رَجُلٍ وَاَخِيْهِ ..... وَلَا الْوَاهِبُ الْمِائَةَ الْهِجَانَ وَ عَبْدَهَا ، وَاَمْثَالُ ذٰلِكَ مِنَ الْمَعْطُوْفَاتِ الْمُمْتَنِعِ تَقْدِيْمُهَا وَتَاْخِيْرُ مَا عُطِفَتْ عَلَيْهِ كَثِيْرَةٌ ، فَلَمَّا لَمْ يَمْتَنِعْ فِيْهَا الْعَطْفُ

لَا يَمْتَنِعُ فِي نَحْوِ مَرَرْتُ بِكَ وَ زَيْدٍ وَإِذَا بَطَلَ كَوْنُ مَا تَعَلَّلُوْا بِهِ مَانِعًا وَجَبَ الْاِعْتِرَافُ بِصِحَّةِ الْجَوَازِ" (شرح الكافيه الشافيه ۳/۱۲۴۷)

یعنی اگر عطف کی صحت کے لیے معطوف علیہ اور معطوف میں سے ہر ایک کا دوسرے کی جگہ واقع ہونا شرط ہو، تو "رُبَّ رَجُلٍ وَ أَخِيهِ" میں "أَخِيهِ" کا "رَجُلٍ" پر عطف صحیح نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ اس میں قلبِ مکانی کرکے اگر کہا جائے "رب أخيه وَ رجلٍ"، تو یہ اضمار قبل الذکر، یعنی ضمیر کا اپنے مرجع کے ذکر سے پہلے واقع ہونے کی بنا پر جائز نہیں، حالانکہ پہلی صورت "رب رجل واخيه" میں عطف کے جواز میں کوئی اختلاف نہیں، کیونکہ اس صورت میں اضمار قبل الذکر لازم نہیں آتا، لہٰذا معلوم ہُوا کہ عطف کی صحت کے لیے معطوف علیہ اور معطوف میں سے ہر ایک کا دوسرے کی جگہ واقع ہونے کو شرط بنانا غلط ہے۔ جبکہ وہ علتیں، جن کی بنیاد پر ضمیر مجرور پر حرفِ جر دہرائے بغیر عطف کو ممنوع بنا دیا گیا ہے، وہ مانع نہیں بن سکیں، تو ضمیر مجرور پر بلا اعادہ جار، عطف کے جواز کو لازمًا تسلیم کرنا پڑے گا۔

شیخ جمال الدین نے تو اس مقام پر تفصیل سے گفتگو کی ہے، لیکن ہم نے بقدرِ ضرورت علت اور اس کی تردید نقل کرنے پر اکتفا کیا ہے، تاکہ معلوم ہو سکے کہ جن علتوں کا سہارا لے کر سیبویہ وغیرہ نے اس عطف کو ممنوع قرار دیا ہے" وہ علتیں کمزور ہونے کی وجہ سے ناقابلِ قبول ہیں، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہُوا کہ ضمیر مجرور پر حرفِ جر کے اعادے کے بغیر عطف ڈالنا جائز ہے۔

اور جہاں تک قراءۃ حمزہ پر ثانی الذکر اعتراض کا تعلق ہے، تو یہ اشکال بظاہر وزنی معلوم ہوتا ہے لیکن کریدنے کے بعد "هَبَاءً مَنْثُوْرًا" ہو کر رہ جاتا ہے، وہ اس طرح کہ "اَلْاَرْحَامِ" جر کے ساتھ "بِهٖ" کی ضمیر مجرور پر معطوف ہے، جب کہ معطوف علیہ "تَسَاءَلُوْنَ" کے بعد واقع ہے۔ تو جس طرح معطوف علیہ سوال سے متعلق ہے، معطوف بھی اسی طرح "تَسَاءَلُوْنَ" کے سوال سے وابستہ ہُوا۔ لہٰذا اس آیت کریمہ میں زیر بحث مسئلہ سوال کرنے کا ہے، قسم اٹھانے کا نہیں۔

سید محمد رشید رضا اُن لوگوں کا تعاقب کرتے ہوئے، جنہوں نے یہاں "تَسَاءَلُوْنَ" کو قسم اور حلف کے معنی میں لیا ہے، فرماتے ہیں:

"أَنْ تَعْلَمُوا أَنَّ هٰذَا الْجَوَابَ مَبْنِيٌّ عَلٰى كَوْنِ التَّسَاؤُلِ بِالْأَرْحَامِ هُوَ قَسَمًا بِهَا، وَهُوَ خَطَأٌ، فَإِنَّ السُّؤَالَ بِاللّٰهِ غَيْرُ الْقَسَمِ بِاللّٰهِ، وَالسُّؤَالَ بِالرَّحِمِ غَيْرُ الْحَلِفِ بِهَا، وَقَدْ أَوْضَحَ شَيْخُ الْإِسْلَامِ ابْنُ تَيْمِيَّةَ هٰذَا الْفَرْقَ فِي الْقَاعِدَةِ الَّتِي قَرَّرَ فِيهَا مَسْأَلَةَ التَّوَسُّلِ وَالْوَسِيلَةِ فَقَالَ وَأَجَادَ، وَحَقَّقَ كَعَادَتِهِ جَزَاهُ اللّٰهُ عَنْ دِينِهِ وَنَفْسِهِ خَيْرَ الْجَزَاءِ."

(تفسیر المنار ۴/۳۳۲)

یعنی "وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامِ" کو جر کی حالت میں قسم پر محمول کر لینا غلطی ہے۔ کیونکہ سوال باللہ، قسم باللہ سے مختلف ہے، اسی طرح سوال بالرحم اور حلف بالرحم دونوں الگ الگ ہیں، اور شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ نے اپنے رسالہ "التوسل والوسیلہ" میں اپنی عادت کے مطابق اس فرق کو خوب واضح کیا ہے۔

مگر طلوعِ اسلام نے یہاں بھی علمی لحاظ سے بری طرح ٹھوکر کھاتے ہوئے لکھا ہے:

"بلکہ امام قرطبی نے دعوٰی کیا ہے کہ جمہور ائمہ نے صحیح مسلم کی ایک حدیث کے حوالے سے اس غلط قاعدے کے استعمال پر اصرار کو رسول اللہ صلعم کی توہین قرار دیا ہے۔　　(بحوالہ الجامع لاحکام القرآن")

یہ عبارت ہم نے طلوعِ اسلام مارچ ۸۶ء سے نقل کی ہے۔ جو کہ اس نے اہلحدیث پر اعتراض کے لیے لکھی ہے —— لیکن قارئین حیران ہوں گے کہ اس حدیث کے حوالے سے تفسیر قرطبی میں یہ دعوٰی امام قرطبی کا نہیں نحاس کا ہے۔ امام قرطبی تو اس دعوٰی کے ناقل ہیں۔ جبکہ طلوعِ اسلام نے اپنی جہالت کا ثبوت فراہم کرتے ہوئے اسے نخواہ مخواہ امام قرطبی کے سر منڈھ دیا ہے —— اصل الفاظ ملاحظہ ہوں:

"قَالَ النَّحَّاسُ: وَقَوْلُ بَعْضِهِمْ "وَالْأَرْحَامِ"

قسمٌ، خطأٌ من المعنی والاعراب لان الحدیث عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم یدل علی النصب"

(الجامع لاحکام القرآن ص ۲/۳ ۱۵)

اور امام قرطبی نے ایک دوسرا قول زجاج سے بھی نقل کیا ہے۔ چنانچہ ان میں سے کوئی قول بھی امام قرطبی کا اپنا نہیں ہے۔ پھر تعجب ہے کہ "طلوعِ اسلام" کی نظر میں غیر قرطبی کا یہ دعویٰ قرطبی کا دعویٰ کیسے بن گیا؟ جبکہ زجاج اور نحاس دونوں ناموں کے حروف میں کوئی بھی حرف تہجی "قرطبی" کے حروفِ تہجی کے ساتھ مشترک نہیں ہے ——— لہٰذا یہ لوگ اس مقام پر اپنی کوتاہ فہمی کا جتنا بھی ماتم کریں کم ہے کہ وہ اس عبارت سے یہ تک سمجھنے میں ناکام رہے ہیں کہ یہ دعویٰ کرنے والا کون ہے؟ تاہم چیلنج علماء اہلحدیث کے مبلغ علم کو کیا جا رہا ہے ——— آہ ع

بریں عقل و دانش بباید گریست!

پھر یہ تو

؎ ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا

آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا؟

——— یہی امام قرطبی، نحاس اور زجاج کے مذکورہ اقوال نقل کرنے کے بعد نہ صرف ان کی تردید کر رہے ہیں، بلکہ ضمیر مجرور پر حرفِ جر کے بغیر عطف کے جواز کو ثابت کرنے میں بھی وہ سرگرم دکھائی دیتے ہیں۔ چنانچہ اس کتاب کے اگلے صفحہ پر وہ ابو نصر قشیری سے ان اقوال کی تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"وردّہ الامام ابو نصر عبد الرحیم بن عبد الکریم القشیری، واختار العطف فقال: ومثل ھذا الکلام مردود عند ائمۃ الدین، لان القراءات التی قرأ بھا ائمۃ القراء ثبتت عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم تواترا ۔۔۔!"

(الجامع لاحکام القرآن ص ۲/۴ ۱۵)

یعنی ابو نصر قشیری نے حرفِ جر دہرائے بغیر عطف کو پسند فرمایا ہے اور کہا ہے کہ نحاس، زجاج اور ابن عطیہ کی کلام ائمہ دین کے ہاں مردود ہے۔ کیونکہ قراء کرام

کی قراءات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے تواتر کے ساتھ ثابت ہیں، جسے اہلِ فن بخوبی جانتے ہیں۔ لہٰذا جس نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت شدہ قراءت کا انکار کردیا، اس نے پیغمبر اسلام کی قراءت کو قبیح سمجھا۔

نحاس وغیرہ کے اقوال کو قرطبی کا دعویٰ بنا ڈالنا، اور امام قرطبی کی قشیری کے حوالہ سے ان اقوال کی تردید کو گول کر جانا بلکہ امام قرطبی کے اصل موقف کو چھپا لینا یا تو بددیانتی کی انتہا ہے اور یا پھر ادارہ طلوع اسلام کی جہالت کا منہ بولتا ثبوت ! ——— غالباً یہی وہ "خوبیاں" ہیں جن کی بناء پر طلوع اسلام اپریل ۸۶ء میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ:

"وہ (غلام احمد پرویز) اپنے تربیت یافتہ شاگردوں کی ایسی جماعت تیار کر گئے ہیں جو نہ صرف یہ کہ ان کے فکر کی بہترین علمبردار ثابت ہوگی بلکہ اس کام کو مزید آگے بڑھانے کی استطاعت بھی رکھتی ہے۔"

چنانچہ تربیت یافتگان کی جہالت کے ان نمونوں کو دیکھ کر قارئین کو ان کے ساقی کی شناخت بھی ہو گئی ہوگی، شاگردوں کی وساطت سے استاد کو پہچان لینا کچھ مشکل نہیں ہوتا۔

تعجب بالائے تعجب کہ اس فہم و فراست پر "طلوعِ اسلام" کو اس قدر ناز ہے کہ وہ "اہلحدیث" کی طرف سے شکریہ اور تبریک کے تحائف وصول کرنے کے لیے بیتاب نظر آتا ہے اور اس کی طرف للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہا ہے یہ کہتے ہوئے کہ:

"لیکن اتنی اخلاقی جراءت نہ تھی کہ طلوعِ اسلام کا شکریہ ادا کیا جاتا!"

——— جی نہیں، منہ دھو رکھیے! آپ اس قابل ہرگز نہیں ہیں کہ آپ کا شکریہ ادا کیا جائے ——— ہاں اگر آپ کو دادِ تحسین ہی وصول کرنی ہے تو لندن یا پیرس جائیے، جہاں سے آپ کو اسلام اور علوم اسلام پر اپنی جہالت کے دبیز پردے ڈالنے کے لیے مسموم مواد فراہم ہوتا ہے۔ وہاں اپنی ان خرافات کا فرنگی زبانوں میں ترجمہ کرکے انہیں پھیلائیے تو شاید کچھ حق الخدمت وصول ہو جائے۔ البتہ یہاں تک اہلحدیث کا تعلق ہے تو اہلحدیث پر ناحق طعن و تشنیع کرنے پر آپ کو ان سے تحریری معافی کا طالب ہونا چاہیے ——— ورنہ بتلائیے کہ آپ شکریہ کے مستحق آخر کس بناء پر ہیں؟ ——— کیا غیر قرطبی کے قول کو امام قرطبی کا دعویٰ بنا دینے پر؟ ——— قرطبی کی قشیری سے تردید والی عبارت چھپا لینے پر؟ یا مسئلہ زیرِ بحث میں قرطبی کا اصل موقف نہ سمجھنے پر؟

—— لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَفْرَحُونَ بِمَآ أَتَوْا وَّيُحِبُّونَ أَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۚ (آل عمران : ۱۸۸)

طلوعِ اسلام کی دوسری غلطی خلط مبحث کی ہے ۔ کہ بات تو شروع کی تھی عطف کی، اور صحیح حدیث کا تعلق غیر اللہ کے ساتھ قسم اٹھانے کی ممانعت سے ہے، اب عطف کی بحث میں قسم کے موضوع کو گڈمڈ کر دینا چہ معنی دارد ؟—— جب "الارحام" میں واؤ عاطفہ ہو گی، تب حدیث شریف کا اس سے کوئی تعلق ہی نہیں، کیونکہ معطوف علیہ سوال سے متعلق ہے، لہٰذا اس پر معطوف کا تعلق بھی سوال ہی سے ہوگا، نہ کہ قسم اور حلف سے !—— جیسا کہ تفسیر المنار کی عبارت سے اس کی وضاحت ہو چکی ہے۔

—— اس صورتِ حال کے پیشِ نظر، بقولِ شما، اس غلط قاعدے کے استعمال سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کیسے ہوئی ؟ —— کیا "تساءلون" کا معنی "تحالفون" ہے ؟ جبکہ حدیث شریف سے مراد یہ ہے کہ غیر اللہ کی قسم نہ اٹھائی جائے۔ لہٰذا توہین جب ممکن ہے، جب" والارحام" میں واؤ عاطفہ کی بجائے واؤ قسمیہ بنائی جائے۔ اور واؤ قسمیہ کا عطف کے قاعدے سے کوئی تعلق ہی نہیں !

قارئین کرام غور فرمائیں، طلوعِ اسلام نے بات کی ابتداء ان الفاظ سے کی تھی :

"بلکہ امام قرطبی نے دعویٰ کیا ہے . . . . !"

اور انتہا یہ کہ :

"بحوالہ الجامع لاحکام القرآن !"

—— یہاں لفظ "بحوالہ" واضح طور پر یہ بتلا رہا ہے کہ "طلوعِ اسلام" کی نظر میں امام قرطبی کا یہ دعویٰ کسی دوسرے شخص کی تصنیف" الجامع لاحکام القرآن" کے حوالہ سے ہے —— گویا اہلحدیث علماء کا مبلغ علم ناپنے والے اس ادارہ کو یہ تک معلوم نہیں کہ یہ کتاب امام قرطبی کی اپنی تصنیف ہے۔ ورنہ اسے "بحوالہ" کے لفظ کے اضافہ کی ضرورت محسوس نہ ہوتی —— یوں اس عبارت کی ابتداء بھی غلط ہے اور انتہاء بھی غلط —— ابتداء اس لیے کہ امام قرطبی کا یہ دعویٰ ہے ہی نہیں بلکہ نحاس کا ہے۔ لیکن طلوعِ اسلام نے اسے امام قرطبی سے منسوب کر دیا ہے —— اور انتہاء اس لیے غلط ہے کہ اس نے

"الجامع لاحکام القرآن" کو امام قرطبی کے علاوہ کسی دوسرے کی تصنیف سمجھ لیا ہے! — یعنی غیر قرطبی کا قول قرطبی کے ذمہ لگا دیا، اور قرطبی کی اپنی تصنیف کو کسی دوسرے سے منسوب کر دیا — بالکل یہی حال ان لوگوں کی قرآن فہمی کا بھی ہے — پھر نہ جانے یہ لوگ ہمارے منہ کیوں آتے ہیں؟

اسی پر بس نہیں، اس عبارت سے قبل بھی طلوع اسلام کے کچھ شاہکار قابلِ مطالعہ ہیں۔ اس نے لکھا ہے:

"پاکستان میں شائع ہونے والے مذہبی رسائل میں سے ہفت روزہ اہلحدیث واحد اخبار تھا جو اہلِ سنّت کے درود کی بجائے اہلِ تشیّع کا درود استعمال کرتا تھا۔ اہلِ تشیّع نے اپنے ایک خاص عقیدے کی تائید میں معروف درود کے الفاظ میں "آلہٖ" کا اضافہ کر دیا ہے۔ یہ اضافہ عربی قواعد کے مطابق درست نہ تھا۔" (طلوعِ اسلام مارچ ۸۶ء)

آگے چلنے سے پیشتر طلوع اسلام کو یہ بتا دینا مناسب رہے گا کہ سطورِ بالا میں اس نے مذہبی رسائل والوں کو ایک ہی سانس میں اہلِ سنّت بھی تسلیم کر لیا ہے۔ اور اہلِ سنّت سے مراد اہلِ دین ہیں۔ کیونکہ یہاں سنّت سے اگر سنّتِ رسولؐ بالفرض خارج بھی ہو تو سنّت اللہ بہر حال موجود ہے، جو عین دین ہے — چنانچہ اہلِ سنّت کہلانا ہمارے لیے تو بہر حال اعزاز ہے، لیکن آپ لوگوں کے سر پر مصیبت یہ سوار ہے کہ:

"اسلام دین ہے مذہب نہیں، مذہب کا تو لفظ تک قرآن میں نہیں آیا۔ خدا کے رسول ہمیشہ دین لے کر آتے تھے، لیکن ان کے بعد ان کے نام لیوا دین کو مذہب میں تبدیل کر دیتے۔"

(شاہکارِ رسالت (از پرویز) ص۳۷)

نیز طلوعِ اسلام نومبر ۸۵ء کے صفحہ ۱۸ پر ہے:

"قرآن تو محض تلاوت کے لیے رہ گیا اور خارج از قرآن عناصر نے اس کی جگہ لے لی۔ اور اس طرح دین مذہب میں تبدیل ہو گیا۔ اب جو کچھ اسلام کے نام سے دنیا میں متعارف ہے، وہ دین نہیں بلکہ مذہب ہے!"

لیکن ناخلف "تربیت یافتگان" نے اب مذہب والوں کو اہلِ سنت یا با لفاظِ دیگر اہلِ دین کہہ کر، دین و مذہب کی تفریق ختم کر کے اپنے باباجی (پرویز) کو جو خراجِ تحسین پیش کیا ہے تو ان کی تو روح بھی جھنجھنا اٹھی ہو گی کہ کمبختوں نے عمر بھر کی کمائی پر پانی پھیر کر رکھ دیا ہے ـــــ اور یہ اس پر مستزاد کہ اثباتِ عذابِ قبر والی حدیثوں کی حقیقت بھی اب ان پر واضح ہو رہی ہو گی۔

ـــــ رہی یہ بات کہ:

"اہلِ تشیع نے اپنے ایک خاص عقیدے کی تائید میں معروف درود کے الفاظ میں "آلہٖ" کا اضافہ کر دیا ہے۔ یہ اضافہ عربی قواعد کے مطابق درست نہ تھا"

تو ہم بڑے خلوص سے آپ کی چابکدستیوں کے معترف ہیں، لیکن غیر محتاط قلم کی باگ ڈور کو ڈھیلا چھوڑ دینے سے آپ حقائق کو مسخ نہیں کر سکتے۔ جہاں تک اس درود کے عربی قواعد کے خلاف ہونے کا تعلق ہے، تو آپ کے اس دعویٰ کا پوسٹ مارٹم ہم کر آئے ہیں ہاں اگر کچھ کمی رہ گئی ہو تو مطلع فرمایئے گا تاکہ یہ شکایت باقی نہ رہے ـــــ رہی یہ بات کہ "آلہٖ" کا یہ اضافہ اہلِ تشیع کی طرف سے ہے، تو یہ بھی آپ لوگوں کو مغالطہ ہے۔ اہلِ سنت کی کتابیں اٹھا کر دیکھئے، آل پر درود کا ثبوت آپ کو اہلِ تشیع کے معرضِ وجود میں آنے سے بہت پہلے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مل جائے گا۔ جیسا کہ صحیحین میں ہے:

"عَنْ اَبِیْ حُمَیْدِ نِ السَّاعِدِیِّ قَالَ: قَالُوْا یَارَسُوْلَ اللّٰہِ کَیْفَ نُصَلِّیْ عَلَیْکَ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قُوْلُوْا اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاَزْوَاجِہٖ وَذُرِّیَّتِہٖ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ وَبَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاَزْوَاجِہٖ وَذُرِّیَّتِہٖ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ"

اور صحیح بخاری میں ہے:

"...... فَقُلْنَا یَارَسُوْلَ اللّٰہِ کَیْفَ الصَّلٰوۃُ عَلَیْکُمْ اَھْلَ الْبَیْتِ فَاِنَّ اللّٰہَ قَدْ عَلَّمَنَا کَیْفَ نُسَلِّمُ

عَلَيْكَ قَالَ قُوْلُوا : اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰى آلِ اِبْرَاهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ ....الخ !

یہ درود ہی تو ہے جس میں "آل" کا لفظ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے ——— بات چونکہ اہلِ سنت کے درود کی چل نکلی تھی، اس لیے ہم نے مذکورہ احادیثِ نبویہ نقل کرنے کی ضرورت محسوس کی ہے۔ ورنہ ہمیں یہ احساس بھی ہے کہ طلوعِ اسلام کا ناقص مزاج اس بلند مرتبہ کلام کی حقیقت تک رسائی حاصل کرنے سے قاصر ہے۔

پھر یہ بھی نہ بھولیئے کہ "صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَعَلٰى آلِهٖ وَسَلَّمَ" کو آپ بھی صحیح تسلیم کرتے ہیں۔ اور "آلہ" کا لفظ اس میں بھی موجود ہے۔ اگرچہ اس "آل" سے آپ اہلِ بیت کی بجائے "اُمّتِ مسلمہ" ہی کیوں نہ مراد لیں لیکن کیا اہلِ بیت، اُمّتِ مسلمہ سے (معاذ اللہ) خارج ہیں؟ اہلِ بیت کے بارے میں رافضہ کے غلو کا یہ مطلب تو نہیں کہ ان سے دشمنی شروع کر دی جائے۔ اور نہ ہی اہلِ بیت کا اس میں کوئی جرم ہے ——— بلکہ اوپر صحیحین کی حدیث میں آپ نے دیکھا کہ درود میں اہلِ بیت (اَزْوَاجِهٖ وَذُرِّيَّتِهٖ) کا مستقل ذکر موجود ہے ——— پھر آپ نے یہ کیونکر کہہ دیا کہ "الحدیث" اہلِ تشیع کا درود استعمال کرتا ہے؟

علاوہ ازیں جب آپ لوگوں نے تعلیماتِ نبویہ سے الگ ہو کر اپنی ذہنی آوارگی سے اللہ تعالیٰ کی کتاب قرآنِ مجید کی نصوص کو وقت کے تقاضوں کے مطابق ڈھال لینے کا قائل ہو کر کتابِ الٰہی کو بازیچۂ اطفال بنا کر رکھ دیا ہے، آپ کو دوسروں پر اعتراض کا حق ہی کہاں پہنچتا ہے؟ کیونکہ بقولِ شما اہلِ تشیع نے بھی درود کے معروف الفاظ کو اپنے خاص عقیدہ کے مطابق ہی ڈھالا ہے، ہو سکتا ہے کہ ان کے وقت کا تقاضا بھی اس اضافے کے بغیر پورا نہ ہوتا ہو ——— ہمارا مقصود یہ ہے کہ آپ دوسروں پر اعتراض کرنے سے پہلے اپنی اصلاح کریں، ورنہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ ؎

چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد !

ظلمات بعضها فوق بعض :

آخر میں ہم یہ بھی بتا دینا چاہتے ہیں کہ رسالہ "طلوعِ اسلام" کی جس عبارت کی

تردید اور اس پر تنقید ہمارے پیش نظر ہے، وہ بمشکل ایک صفحہ تک پہنچتی ہے۔ اس بیس بائیس سطر پر مشتمل عبارت کی اگر ہم غلطیاں شمار کرنا شروع کر دیں تو خطا سے پاک شاید چند ایک جملے ہی باقی بچیں۔ لیکن ہم صرف اُن غلطیوں کو اجمالاً ضبط تحریر میں لا رہے ہیں، جن کو اغلوطات سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اور جن کی تفصیل گزشتہ سطور میں دیکھی جا سکتی ہے، تاکہ طلوعِ اسلام کے حواریوں کو اپنے سرپرست ادارے کا مبلغ علم تولنے میں کوئی دشواری نہ ہو:

۱۔ ایک ہی جملے میں اہلِ مذہب کو اہلِ سنت (اہلِ دین) سے تعبیر کرنا تناقض اور تعارض ہے۔ اس لیے کہ اس طائفے کے نقطہ نظر سے مذہب اور دین میں بڑا فرق ہے۔

۲۔ "آل" کے لفظ پر مشتمل درود کو اہلِ تشیع کا درود کہنا۔ حالانکہ اہلِ سنت کی کتابوں میں جابجا اس کا ذکر موجود ہے۔ اور وہ اپنی پانچ نمازوں میں "آل" پر مشتمل درود ہی تو پڑھتے ہیں۔ علاوہ ازیں خود بھی اس پارٹی نے حرفِ جار کے دہرانے سے "آلہٖ" پر مشتمل درود کو درست کہا ہے۔

۳۔ "الجامع لاحکام القرآن" سے امام قرطبی کا دعویٰ نقل کرتے وقت "بحوالہ" کا لفظ لانا، جو کہ سیاق کے اعتبار سے لغو ہے۔

۴۔ غیر قرطبی کے دعویٰ کو امام قرطبی کا دعویٰ بنا ڈالنا۔

۵۔ "صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم" کہنے کو فحش غلطی سمجھنا، حالانکہ تحقیق کے بعد اسے درست تسلیم کئے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔

۶۔ عطف کی بحث میں قسم کی بحث سے استدلال کر کے خلط مبحث کا ارتکاب کرنا۔

۷۔ نبی اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے درود میں ثابت شدہ کلمہ کو ایسے فرقہ کا اضافہ بتانا جس کا وجود ہی آپؐ کے دور میں ناپید تھا۔

۸۔ اسم موصول "مَنْ" کے اسمِ ظاہر سے خارج ہونے کا دعویٰ کرنا۔

۹۔ نحاس وغیرہ کے اقوال کی تردید میں ائمہ دین سے امام قرطبی کی منقولہ عبارت کو چھپا لینا۔

۱۰۔ اس عطف کے مسئلہ میں امام قرطبی کے اصل موقف کو سمجھنے سے قاصر رہنا۔ وغیرہ! ـــــ وَاِنْ تَعُوْدُوْا نَعُدْ! ـــــ ـــــ وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى نَبِيِّهٖ مُحَمَّدٍ وَّسَلَّمَ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ!

تحقیق و تنقید

صاحبزادہ برق التوحیدی ۔ فیصل آباد

بیعتِ عقبہ ثانیہ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ

ماہنامہ "ترجمان القرآن" اگست ۱۹۸۶ء لاہور، میں ڈاکٹر سلیمان صاحب اظہر کا ایک مضمون شائع ہوا ہے، جس میں موصوف نے ایک نئی تحقیق پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ بلاشبہ تحقیق کی تحسین ہونی چاہیئے، مگر افسوس ہے کہ ڈاکٹر موصوف سلف کی تحقیقات کو چیلنج کر کے اس کوشش سے جو نتیجہ اخذ کرنا چاہتے ہیں، اس میں ناکام رہے ہیں۔ کیونکہ موصوف نے جو صغریٰ کبریٰ بنائے ہیں وہ صحیح نہیں۔ ظاہر ہے جب اصولاً صغریٰ کبریٰ ہی صحیح نہ ہوں تو صحیح نتیجہ کی توقع عبث ہے۔ کچھ یہی حال ڈاکٹر صاحب موصوف کی تحقیق کا ہے۔ جس سے بعض غلط فہمیاں، اور اسلاف کی کوششوں پر بداعتمادی کی فضا پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ جس کے ازالہ کی خاطر درج ذیل سطور قارئین کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہیں۔

تاریخ و سیرت کی متداول کتب میں بیعتِ عقبہ ثانیہ کی جو تفصیل موجود ہے اور جس میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی شرکت کا واضح ذکر ہے، ڈاکٹر صاحب نے اسے بیان کرتے ہوئے یہ باور کرانے کی غرض سے، کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ اس موقعہ پر موجود نہ تھے، تین سوال اٹھائے ہیں۔ انہوں نے لکھا ہے:

"اس واقعہ میں درج ذیل باتیں محلِ نظر معلوم ہوتی ہیں:

۱۔ کیا حضرت عباس رضی اللہ عنہ واقعتاً عقبہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تشریف لے گئے تھے؟

۲۔ اگر مذکورہ بالا سوال کا جواب ہاں میں ہے، تو کیا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا یہ فرمانا "ان کا خاندان ہمیشہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سینہ سپر رہا ہے۔" درست ہے؟

۳۔ کیا ان کی تقریر کے آخری حصہ کہ "محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے پاس جانا چاہتے ہیں اگر تم ان کی حفاظت کر سکتے ہو تو لے جاؤ ورنہ ابھی سے جواب دے دو۔"

اسی طرح ہونا چاہیئے ؟ کیا یہ حصہ معاملات کے لین دین میں ان کی مہارت کا اظہار کرنا ہے یا ان الفاظ کے ساتھ انہوں نے آنحضرت صلعم کی پوزیشن کو انصار کے مقابلہ میں کمزور کر دیا ہے ؟"

ان سوالات سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب موصوف کو براہ راست حضرت عباسؓ کی بیعتِ عقبہ میں شرکت سے انکار نہیں بلکہ اس کو تسلیم کرنے میں ان کے سامنے دو آخری صورتوں کا استحالہ ہے۔ اور ہم سمجھتے ہیں کہ اگر موصوف ذرا تحمل سے اس پورے واقعہ کا مطالعہ کرتے تو یہ رکاوٹ بھی ختم ہو جاتی۔ کیونکہ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ابو طالب کی وفات کے بعد بھی دو طرح کے لوگ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حفاظت و مدافعت فرماتے تھے۔ ایک طبقہ ان لوگوں کا تھا جو مسلمان ہو چکے تھے جیسے حضرت عمرؓ، حضرت حمزہؓ وغیرہ۔ دوسرے وہ جن کا حسب و نسب کی وجہ سے نبی علیہ السلام سے تعلق تھا۔ چنانچہ خود حضرت عباسؓ نے موقعہ عقبہ پر فرمایا:

"يَمْنَعُهُ وَاللهِ مِنَّا مَنْ كَانَ عَلٰى قَوْلِهٖ وَمَنْ لَّمْ يَكُنْ مِنَّا عَلٰى قَوْلِهٖ يَمْنَعُهُ لِلْحَسَبِ وَالشَّرَفِ" [1]

چنانچہ جو لوگ مسلمان نہ ہونے کے باوجود صرف نسبی تعلق کی بنا پر آپؐ کا دفاع اور حفاظت کرتے تھے، ان میں حضرت عباسؓ بالخصوص پیش پیش تھے۔ بلکہ آپؓ نہ صرف نبی علیہ السلام ہی نہیں دیگر نو مسلم صحابہ کرامؓ کو بھی پناہ دیتے تھے۔ حافظ ابنِ حجرؒ فرماتے ہیں:

"كَانَ أَنْصَرَ النَّاسِ لِرَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعْدَ أَبِيْ طَالِبٍ ...... وَكَانَ مَنْ هُنَاكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ يَتَقَوَّوْنَ بِهٖ وَيَصِيْرُوْنَ إِلَيْهِ .... فَكَانَ عَوْنًا لَهُمْ عَلٰى إِسْلَامِهِمْ" [2]

اور ایسا ہوتا بھی کیوں نہ؟ کہ ایک تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ آپؐ کے خصوصی تعلقدار تھے، دوسرے آپؓ اپنے خاندان کے رئیس اور با حیثیت و با اختیار آدمی تھے۔ جس کا

---

[1] طبقات ابنِ سعد ص ۲۲۲/۱، [2] تہذیب لابنِ حجر ص ۱۲۲ ج ۵، تاریخ خمیس ص ۳۱۸ ج ۱، تہذیب تاریخ ابنِ عساکر ص ۲۳۲ ج ۷۔

تقاضا یہی تھا کہ آپؓ حضور علیہ السلام کا تعارف کرواتے ہوئے یہ بتائیں کہ ہم نے ان کا ہمیشہ دفاع کیا اور اس میں وہ من وجہٍ حق بجانب تھے۔ کیونکہ وفات ابی طالب کے بعد انہوں نے ابو طالب کی طرح نبی علیہ السلام کی مکمل حوصلہ افزائی فرمائی۔ اور ابو طالب کی کفالت سے لے کر اس موقعہ تک کی طویل مدافعت وصیانت کو اگر خاندان کی طرف منسوب کیا ہے تو یہ خلافِ واقعہ نہیں۔ البتہ جہاں تک بعض تکالیف اور آزمائشوں یا اسفار و پناہ کا تعلق ہے تو یہ تمام کچھ شعبِ ابی طالب میں نظر بندی سے بہر حال کمتر ہیں۔ جس سے ابو طالب کی وفاو مدافعت کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ پھر اس تعبیر پر یہ شہادت بھی پیش کی جا سکتی ہے کہ نقضِ صحیفہ کے وقت ہشام بن عمرو، زہیر بن امیۃ، مطعم بن عدی، اور ابو البختری کا کردار غیر مسلم ہونے کے باوجود انسانی ہمدردی اور خاندانی جذبات کا مظہر ہے، جس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو شعب ابی طالب سے آزادی نصیب ہوئی۔

جہاں تک دوسری صورتِ استحالہ کا تعلق ہے، تو اگر تھوڑا سا غور کیا جائے تو حضرت عباسؓ کے مذکورہ حصہ خطاب کے بعد یہ سمجھنا بالکل آسان ہو جاتا ہے کہ انہوں نے یہ الفاظ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پوزیشن کو کمزور کرنے کے لیے نہیں، بلکہ مضبوط اور بہتر بنانے کے لیے فرمائے۔ تاکہ وہ یہ نہ سمجھیں کہ یہ شخص خاندان کا راندۂ نظر ہے۔ بلکہ یہ باور کریں کہ ہم آج بھی آپؐ کی حفاظت کا ذمہ اٹھا سکتے ہیں، اور حضرت عباسؓ کا نبی علیہ السلام سے تعلق و معمول بھی اس نتیجہ کی اجازت نہیں دیتا کہ یہ الفاظ آپؐ کی پوزیشن کو کمزور کرنے کے لیے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے فرمایا: "اگر حفاظت نہیں کر سکتے تو ابھی جواب دیدو!" ــــ پھر اگر معاہدات اور خاندانوں اور اقوام کے حلیف بننے کی روشنی میں اس بات کو دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ حضرت عباسؓ نے آپؐ کو کمزور نہیں بلکہ خوددار، با اثر اور حسب و شرف والی شخصیت کے طور پر متعارف کرایا ـــــ اور پوزیشن کے کمزور کرنے والا نتیجہ حضرت عباسؓ کی اس وضاحت کے بعد اخذ کرنا قطعاً درست نہیں جس میں آپؓ فرماتے ہیں کہ "ہم نے مسلمان نہ ہونے کے باوجود اپنے ہم فکر لوگوں سے آپؐ کو تحفظ دیا۔ آپؐ اپنی قوم میں باعزت اور شہر میں محفوظ ہیں، لیکن اس کے باوجود آپؐ کی خواہش ہے کہ وہ آپ لوگوں کے پاس آئیں۔" ان کے الفاظ ہیں:

"وَقَدْ مَنَعْنَاهُ مِنْ قَوْمِنَا هُوَ عَلَىٰ مِثْلِ رَأْيِنَا فِيهِ

فَهُوَ فِي عِزَّةٍ مِنْ قَوْمِهِ وَمَنَعَةٍ فِي بَلَدِهِ وَإِنَّهُ قَدْ أَبَى إِلَّا الْإِنْحِيَازَ إِلَيْكُمْ وَاللُّحُوقَ بِكُمْ"[۱]

اور یہ خواہش وارادہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مصعب بن عمیرؓ کی تبلیغ سے مسلمان ہونے والے انصار کی فرمائش پر فرمایا۔ علاوہ ازیں اگر حضرت عباسؓ کے یہ الفاظ فی الواقع آپؐ کی پوزیشن کمزور کرنے کے مترادف تھے تو پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خود چاہیئے تھا کہ اس کی وضاحت فرماتے۔ کیونکہ عام حالات میں کوئی بھی ایسا گوارا نہیں کر سکتا۔ مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمایا:

"وَعَلَى أَنْ تَنْصُرُونِي فَتَمْنَعُونِي إِذَا قَدِمْتُ عَلَيْكُمْ مِمَّا تَمْنَعُونَ مِنْهُ أَنْفُسَكُمْ وَأَزْوَاجَكُمْ وَنِسَاءَكُمْ وَلَكُمُ الْجَنَّةُ"[۲]

یعنی "مجھ سے اس بات پر معاہدہ کرو کہ میرا تعاون کرو گے اور جس طرح اپنی بال اپنے اہل وعیال کی حفاظت و مدافعت کرتے ہو میری آمد کے بعد میری بھی مدافعت کرو گے تو اس کے بدلے جنت پاؤ گے۔"

یہی نہیں بلکہ اس کے جواب میں انصارؓ نے بھی کہا کہ "اگر آپؐ اپنے مشن میں کامیاب ہو گئے تو ہمیں بھلا کر کسی اور کو ترجیح تو نہیں دیں گے؟ تو آپؐ نے مسکراتے ہوئے فرمایا:

"أَنَا مِنْكُمْ وَأَنْتُمْ مِنِّي أُحَارِبُ مَنْ حَارَبْتُمْ وَأُسَالِمُ مَنْ سَالَمْتُمْ"

یعنی "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اب تمہارا اور میرا تعلق ایک جسم کا سا ہے۔ جس سے تمہاری لڑائی ہو گی، میں بھی اس کے خلاف لڑوں گا اور جس سے تمہاری صلح و پناہ ہو گی، میں بھی اس سے صلح رکھوں گا!"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فریقین بھی ایک دوسرے سے معاہدہ میں تحفظات کے طالب تھے، جس میں کسی کی خفت و کمزوری کا کوئی پہلو نہیں۔

بیعت عقبۂ ثانیہ میں حضرت عباسؓ کی عدمِ شرکت کے موقف کو ثابت کرنے کے لیے، ان باتوں کے علاوہ ڈاکٹر صاحب موصوف نے بعض خارجی سہارے بھی تلاش کئے

---

[۱] بدایہ لابن کثیر ص ۱۶۰ ج ۳ [۲] ایضاً ۱۰۹/۲

ہیں۔ جن کا ذکر بھی مختصراً ضروری معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً انہوں نے لکھا ہے کہ:

"آپؐ نے معززین طائف سے کہا تھا کہ اہلِ مکہ کو میرے اس مشن کے بارے میں نہ بتانا لیکن انہوں نے یہ بات بھی ماننے سے انکار کر دیا۔" اس عبارت میں موصوف نے "مشن" کا لفظ لا کر اور آخری الفاظ کا اضافہ کر کے دراصل اپنی بات کو مصنوعی وزن دینے کی نہ صرف کوشش کی ہے بلکہ اوراقِ تاریخ سے بھی زیادتی کی ہے۔ جو تاریخ بیان کرنے سے زیادہ تاریخ سازی کے ضمن میں آتی ہے۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نہ مشن کسی سے مخفی تھا اور نہ اس کی تبلیغ میں اسفار پوشیدہ تھے۔ البتہ جو بات آپؐ نے فرمائی وہ صرف یہ تھی کہ ہماری جو گفتگو ہوئی ہے اور تم نے جو میری دعوت پر ردِ عمل کیا ہے، میری قوم تک نہیں پہنچنا چاہیئے۔ کیونکہ اس سے وہ مزید اپنے موقف پر اڑ جائیں گے جیسا کہ تاریخ کے ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے:

"فَقَامَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ عِنْدِهِمْ وَقَدْ يَئِسَ مِنْ خَيْرِ ثَقِيفٍ وَقَدْ قَالَ لَهُمْ إِذَا فَعَلْتُمْ مَا فَعَلْتُمْ فَاكْتُمُوا عَنِّي وَكَرِهَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْ يُبَلِّغَ قَوْمَهُ عَنْهُ فَيُذْئِرُهُمْ ذٰلِكَ عَلَيْهِ۔"[1]

واقعہ دراصل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم طائف میں جن تین سرداروں عبد یالیل، مسعود اور حبیب بن عمرو کے پاس گئے، انہوں نے کچھ جواب اس قسم کے دیے تھے جو نہ صرف مایوس کن تھے بلکہ اگر ان کا اہلِ مکہ کو علم ہوتا تو وہ سمجھتے کہ اب اس شخص کو نہ اندرونِ خانہ قبولیت ہے نہ بیرونِ مکہ۔ لہٰذا اس قسم کے آدمی کے خلاف جو بھی انتہائی قدم اٹھایا جائے اس میں کوئی قباحت نہیں۔ لیکن اتفاق ہے کہ اہلِ طائف نے کوئی بات بتائی یا نہ، اس واقعہ کے بعد آپؐ کے خلاف کارروائیاں سخت ہو گئیں۔ جس کا ثبوت دار الندوہ کی مشاورت ہمارے سامنے ہے۔

جہاں تک حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے مذکورۃ الصدر الفاظ کے ضمن میں اس بات کا تعلق ہے کہ مطعم بن عدی نے پناہ کیوں دی یا اس کی پناہ کو کسی نے چیلنج کیوں نہ کیا؟ بظاہر

[1] ابن ہشام ۱۹/۱۸ بدایہ لابن کثیر ص ۱۳۵ ج ۳،

یہ بات بڑی معقول معلوم ہوتی ہے۔ مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ حافظ ابنِ کثیرؒ کی وضاحت کے مطابق یہ پناہ ملنے کے چند دن بعد حضور علیہ السلام ہجرت فرما جاتے ہیں، تو اس چند دنوں کے قلیل عرصہ میں اس پناہ پر اہلِ خاندان کی طرف سے کسی خاص ردِّ عمل کی ضرورت نہ تھی ـــــ پھر یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ مطعم بن عدی کی یہ پناہ مستقل تھی یا عارضی؟۔ ہمارے خیال میں یہ پناہ عارضی اور جز وقتی بلکہ وقع الوقتی تھی۔ جیسا کہ روایاتِ ابنِ کثیرؒ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور علیہ السلام ایک رات مطعم بن عدی کے پاس ٹھہرے، صبح مطعم اور اس کے لڑکوں کے ساتھ طواف کے لیے تشریف لائے اور اس کے بعد ظاہر ہے وہ اپنی جگہ پر چلے گئے مگر نبی علیہ السلام مکہ ہی میں رہے ـــــ اس پناہ کے جز وقتی ہونے پر دیگر قرائن کے علاوہ یہ شہادت بھی ہے کہ مطعم بن عدی کا ہجرت سے تقریباً ایک ماہ بعد انتقال ہوا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اہلِ مکہ کی آخری گھناؤنی سازشِ قتل دار الندوہ میں مطعم بن عدی کی زندگی ہی میں ہوئی۔ اب اس کی پناہ اگر باقی اور دائمی ہوتی تو وہ ضرور کوئی قدم اٹھاتا، مگر اس کے برعکس تاریخ گواہ ہے کہ اس سازش میں نہ صرف مطعم بن عدی کا بھائی طعیمہ بن عدی شریک تھا بلکہ خود اس کا لڑکا جبیر بن مطعم بھی شامل تھا۔ جس سے ظاہر ہے کہ پناہ باقی نہ رہی تھی یا پھر اس قدر کمزور پناہ تھی کہ خود مطعم کے اہلِ خانہ بھی اس کا احترام نہ کرتے تھے۔ تو ایسی پناہ کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا فائدہ یا ہاشمیوں پر کیا اثر ہو سکتا تھا؟

اور جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ بیعتِ عقبہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، مطعم بن عدی یا ابوبکر و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو نظر انداز کر کے حضرت عباسؓ کو کیوں لے گئے؟ یہ بات بھی بظاہر بڑی وزنی معلوم ہوتی ہے، مگر ذرا واقعہ کی گہرائی میں جائیں تو معلوم ہوگا کہ یہ بات "ڈوبتے کو تنکے کا سہارا" سے زیادہ اہمیت و حیثیت نہیں رکھتی۔ کیونکہ اولاً ہم اشارتاً ذکر کر چکے ہیں کہ حضرت عباسؓ کا آنحضرتؐ سے خصوصی تعلق تھا۔ تو آپؐ وہاں پہنچے اور اس لیے گئے کہ جو بات اور معاملہ و معاہدہ طے پاتا ہے اس میں کوئی اختلاف، اجمال یا کمی نہ رہ جائے، جس کے نتائج بعد میں خوشگوار نہ نکلیں۔ ویسے بھی معاہدات میں فریقین کے معاونین بھی ہوتے ہیں، جو بات کو پختہ کرنے اور آگے بڑھانے کا کام دیتے ہیں۔ تقریباً تمام مورخین نے جہاں حضرت عباسؓ کی بیعتِ عقبہ میں شرکت کا ذکر کیا ہے،

وہاں واضح طور پر یہ بھی لکھا ہے کہ:

"وَهُوَ يَوْمَئِذٍ عَلَى دِيْنِ قَوْمِهِ إِلَّا أَنَّهُ أَحَبَّ أَنْ يَحْضُرَ أَمْرَ ابْنِ أَخِيْهِ وَ يُوَثِّقَ لَهُ" [1]

"آپؓ اپنی قوم کے دین (جاہلیت) پر ہوتے ہوئے بھی وہاں اس لیے حاضر ہوئے کہ بھتیجے کے ساتھ ہونے والا یہ معاملہ مشاہدہ کر سکیں اور اسے پختہ بنا سکیں!"

چنانچہ آپؓ نے بالفعل بھی یہی کام انجام دیا —— اب ان دو وجوہ کے علاوہ ایک تیسرا اتفاق بھی ہے، جس کی بنا پر حضرت عباسؓ ہی کو وہاں جانا چاہیے تھا۔ اس اتفاق کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت مصعب بن عمیرؓ کی تبلیغ سے مسلمان ہونے والے اہلِ مدینہ جب موسمِ حج میں حضور علیہ السلام کی ملاقات کے لیے حاضر ہوئے تو وہ آپؐ سے متعارف اور شناسا نہ تھے۔ لہٰذا انہوں نے مکہ میں آکر آپؐ کے متعلق دریافت کیا تو ایک روایت کے مطابق پوچھنے والے نے پوچھا "تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچانتے ہو؟" تو انہوں نے نفی میں جواب دیا۔ اس پر اس نے کہا "عباسؓ کو پہچانتے ہو؟" تو انہوں نے اثبات میں جواب دیتے ہوئے کہا "وہ اکثر تجارت کے لیے ہمارے ہاں آتے جاتے ہیں، ہم انہیں پہچانتے ہیں۔" تو اس بتانے والے نے بتایا کہ "پھر بیت اللہ میں جو شخص حضرت عباسؓ کے پاس بیٹھا ہے وہی محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔" لہٰذا وہ وہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے۔ (ابن ہشام ص ۴۴۹ ج ۱) جبکہ ایک روایت میں آتا ہے کہ ان کی ملاقات نبی علیہ السلام سے حضرت عباسؓ کے گھر میں ہوئی۔

"جَاءَ قَوْمٌ مِنْ أَهْلِ الْعَقَبَةِ يَطْلُبُوْنَ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقِيْلَ لَهُمْ هُوَ فِيْ بَيْتِ الْعَبَّاسِ فَدَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالَ لَهُمُ الْعَبَّاسُ إِنَّ مَعَكُمْ مِنْ قَوْمِكُمْ مَنْ هُوَ مُخَالِفٌ لَكُمْ فَاخْفُوْا أَمْرَكُمْ" [2]

[1] بدایہ ابن کثیر ص ۱۶۱ ج ۳، تاریخ خمیس ص ۳۱۸ ج ۱،

[2] طبقات ابن سعد ص ۲۲۲ ج ۱، ابن خلدون ص ۱۲ ج ۲، تاریخ خمیس ص ۳۱۷ ج ۱

یعنی "اہلِ مدینہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاش میں جب مکہ آئے تو انہیں بتایا گیا کہ نبی علیہ السلام، حضرت عباس رضؓ کے گھر میں ہیں۔ جب وہاں پہنچے (اور گفتگو ہوئی، پروگرام بنا)، تو حضرت عباس رضؓ نے مشورہ دیا کہ اس موقعہ پر تمہارے ساتھ تمہارے مخالف بھی مکہ میں آئے ہوئے ہیں۔ لہٰذا اس پروگرام کو پوشیدہ رکھو!"

اب روایات اس بات پر کم از کم متفق ہیں کہ نبی علیہ السلام کا ان کے ساتھ جو پروگرام بھی بنا، اس کا صرف حضرت عباس رضؓ ہی کو علم تھا اور اسے مخفی رکھنا بھی ضروری تھا۔ یہی وجہ ہے کہ نبی علیہ السلام نے ایامِ تشریق کی تقریباً آخری رات کو مقامِ عقبہ پر جمع ہونے کا پروگرام دیا۔ اب اس پوری تفصیل کا تقاضا یہی تھا کہ کسی اور کے علاوہ نبی علیہ السلام کے ساتھ حضرت عباس رضؓ ہی جاتے۔

چوتھا جہاں تک مطعم بن عدی کا تعلق ہے، اگر ڈاکٹر موصوف کے بقول آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی پناہ میں تھے، تو ظاہر ہے مطعم کو ساتھ لے جانا قرینِ مصلحت نہ تھا۔ کیونکہ اس کا مقصد علاوہ ازیں کیا ہو سکتا تھا کہ آپ خود اس کی پناہ کو عملاً واپس کرتے یا وہ اپنی پناہ واپس لیتا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو پھر وہ کہہ سکتا تھا کہ جب میری پناہ آپ کو حاصل ہے تو کیوں جا رہے ہیں؟ جب کہ نہ صرف آپ کو کوئی خطرہ نہیں بلکہ آزادی ہے یا پھر اس میں میری توہین ہے۔ لہٰذا اس کا ساتھ جانا بھی مناسب نہ تھا، سو آپ اسے نہ لے گئے۔

پانچویں بات ہمیں یہ بھی سوچنا چاہیے کہ اگر بالفرض حضرت عباس رضؓ سفری طور پر ورود میں نبی علیہ السلام کے ساتھ نہ تھے تو عین ممکن ہے، پروگرام کے معلوم ہونے کی وجہ سے آپ رضؓ وہاں بعد میں پہنچ گئے ہوں اور مؤرخین نے اسے حقیقی معیت سے تعبیر کیا ہو۔ اور اس بات کی تائید درج ذیل روایت سے بھی ہوتی ہے:

" فَقَرَأَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سُوْرَةَ إِبْرَاهِيْمَ... ... فَرَقَّ الْقَوْمُ وَأَخْبَتُوْا حِيْنَ سَمِعُوْا وَأَجَابُوْهُ فَمَرَّ الْعَبَّاسُ بْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ وَهُوَ يُكَلِّمُهُمْ وَيُكَلِّمُوْنَهُ فَعَرَفَ صَوْتَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ ابْنَ أَخِيْ مَنْ هٰؤُلَاءِ الَّذِيْنَ عِنْدَكَ قَالَ يَا عَمِّ سُكَّانُ يَثْرِبَ ... قَدْ دَعَوْتُهُمْ إِلٰى مَا دَعَوْتُ إِلَيْهِ مَنْ قَبْلَهُمْ مِنَ الْأَحْيَاءِ فَأَجَابُوْنِيْ

وَصَدَّقُوْنِيْ وَذَكَرُوْا اَنَّهُمْ يُخْرِجُوْنَنِيْ اِلٰى بِلَادِهِمْ فَنَزَلَ الْعَبَّاسُ بْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ وَعَقَلَ رَاحِلَتَهٗ ثُمَّ قَالَ لَهُمْ ! يَا مَعْشَرَ الْاَوْسِ وَالْخَزْرَجِ هٰذَا ابْنُ اَخِيْ وَهُوَ اَحَبُّ النَّاسِ اِلَيَّ فَاِنْ كُنْتُمْ صَدَّقْتُمُوْهُ وَاٰمَنْتُمْ وَاَرَدْتُمْ اِخْرَاجَهٗ مَعَكُمْ فَاِنِّيْ اُرِيْدُ اٰخُذُ عَلَيْكُمْ مَوْثِقًا تَطْمَئِنُّ بِهٖ نَفْسِيْ لَا تَخْذُلُوْهُ وَلَا تَغُرُّوْهُ فَاِنَّ جِيْرَانَكُمُ الْيَهُوْدُ وَالْيَهُوْدُ لَهٗ عَدُوٌّ وَلَا اٰمَنَ مَكْرَهُمْ عَلَيْهِ [۱]

خلاصہ روایت یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مقامِ عقبہ پر جب انصار کے سامنے قرآنِ مجید کی تلاوت کی اور دعوت پیش کی تو انہوں نے تسلیم کر لی۔ اسی گفتگو کے دوران وہاں سے حضرت عباسؓ کا گزر ہوا، جو نبی علیہ السلام کی آواز پہچان کر وہاں ٹھہر گئے۔ جب تفصیل معلوم ہوئی کہ یہ لوگ نہ صرف ایمان لا چکے ہیں بلکہ نبی علیہ السلام کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہیں تو حضرت عباسؓ نے اپنے ہاں نبی علیہ السلام کی حیثیت اور تعلق کو بیان کرنے کے بعد، مدینہ کے یہود آلود ماحول میں، جو خطرات نبی علیہ السلام کو پیش آ سکتے تھے، ان کو بھانپتے ہوئے انصار سے نبی علیہ السلام کی حفاظت و مدافعت کا عہد لیا ــــــــ جس سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت عباسؓ کا اس طرف گزر اور بیعتِ عقبہ کے موقعہ پر موجودگی ایک اتفاقی امر تھا اور زیادہ سے زیادہ یہی نتیجہ اخذ ہو سکتا ہے انکار نہیں۔

چھٹی یہ بات بھی ہمیں سامنے رکھنی چاہیئے کہ اگر اس روایت کو دوسری روایات کے مخالف ہونے کی وجہ سے قبول نہ بھی کیا جائے تو پھر اس سوال کا جواب کیا ہے کہ مقامِ عقبہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، روایات کی تصریح کے مطابق، دو تہائی رات گزرنے کے بعد پہنچے، تو مکہ سے تقریباً دو میل دور اس دشوار گزار راستہ میں آپؐ کا ساتھ کون دے رہا تھا؟ اس بات کو ڈاکٹر موصوف بھی گول کر گئے ہیں۔ حالانکہ حضرت عباسؓ کی معیت کی

---

[۱] دلائل النبوۃ لاصبہانی ص ۱۰۶ ج ۲

نفی کے بعد اس کا جواب ضروری ہو جاتا ہے۔

علاوہ ازیں ڈاکٹر صاحب موصوف اپنے مفروضہ نتیجہ کو صحیح باور کرانے کے لیے بڑی دور کی کوڑی روئے ہیں کہ یہ روایت امر واقعہ میں خلفاء بنی عباس کو خوش کرنے کے لیے بنائی گئی ہے، حقیقت میں کچھ بھی نہیں، تاکہ حضرت عباسؓ کی فضیلت بیان کر کے بنو عباس کے خلفاء کو خوش کیا جائے ــــ ہمیں اعتراف ہے کہ بعض مفاد طلب اور موقع پرست حضرات ایسے کارنامے سرانجام دیتے رہے ہیں مگر ہم علیٰ وجہ البصیرت کہہ سکتے ہیں کہ علماء حق نے ہمیشہ ایسی وضعی روایات کو علیحدہ کر کے اُمت کو ان کی حیثیت سے بھی آگاہ کیا ہے۔ کتنی روایات واحادیث ذاتی و قومی اور فقہی مفاد حاصل کرنے کے لیے وضع کی گئیں، مگر "دیکھنے والے بھی قیامت کی نظر رکھتے ہیں!" ــــ وہ روایات محدثین کی عقاب صفت نظروں سے اوجھل نہ رہیں اور انہوں نے صحیح وسقیم کو جدا جدا کر دکھایا۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ جب موصوف کے اخذ کردہ نتیجہ پر خود ان کا دل مطمئن نہیں ہوا تو بلا ساختہ اور غیر شعوری طور پر ایک ایسی بات کو انہوں نے وضعی کہہ دیا جسے مؤرخین و محدثین نے تقریباً تواتر سے بیان کیا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات موصوف کی تحقیق نہیں بلکہ بوکھلاہٹ اور ذہنی پریشانی کا نتیجہ ہے۔ ورنہ حافظ ابن کثیرؒ، ابن حجرؒ، ابن عساکرؒ، ابن سعدؒ، نوویؒ اور ابن حبانؒ جیسے حفاظ و نقاد کی بیان کردہ بیعتِ عقبہ میں شرکتِ حضرت عباسؓ کو وہ خود ساختہ نہ کہتے ــــ کیونکہ اگر یہ روایت حقائق و واقعات کے برعکس وضعی اور خود ساختہ ہوتی تو یہ مؤرخین و محدثین ضرور اشارہ کرتے، خاموش نہ رہتے!"

پھر لطف کی بات یہ ہے کہ اگر خلفاء بنی عباس کو خوش کرنے کے لیے یہ روایت وضع کی جاتی تو اس تکلف سے کہیں بہتر تھا کہ اس روایت کو بنانے والا حضرت عباسؓ کو بیعتِ عقبہ سے پہلے مسلمان ثابت کرتا، جو کہ بوجوہ اس شرکت سے نہ صرف آسان ہے بلکہ حقیقی فضیلت و منقبت بھی مسلمان ہونا ہی ہے۔ لیکن یہ روایت نہ وضعی ہے نہ اس تکلف کی ضرورت محسوس کی گئی۔ بلکہ تقریباً سب مؤرخین نے روایت میں کھلے الفاظ میں لکھا ہے کہ حضرت عباسؓ ابھی مسلمان نہ ہوئے تھے۔ جس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عباسؓ نسبی تعلق، بھتیجے سے ہمدردی اور حفاظت و صیانت کے جذبات کے تحت بیعتِ عقبہ کے موقع پر موجود تھے۔ اور تمام کتبِ تاریخ اس بات پر متفق

ہیں، اور اس موجودگی و شرکت میں کوئی عقلی و نقلی استحالہ بھی موجود نہیں! — لہٰذا ہم ڈاکٹر صاحب موصوف سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ اپنی تحقیق کو جاری ضرور رکھیں، مگر جو تقاضا اور احتیاط مطلوب ہوتی ہے اس کا دامن بھی ہاتھ سے نہ جانے دیں، تاکہ یہ سرمایۂ افتخار، تشکیک اور پھر آگے بڑھ کر کہیں تکذیب کا شکار و نشانہ نہ بن جائے۔

المعہد العالی للشریعۃ والقضاء

میں

داخلہ

جامعہ لاہور الاسلامیہ کے زیر اہتمام تیسرے ڈپلوما کورس میں داخلہ کیلئے درخواستیں ۲۱ اکتوبر ۱۹۸۶ء تک طلب کی گئی ہیں۔

داخلہ کی اہلیت

ا۔ ایم اے (اسلامیات) یا اس کے مساوی

ب۔ ایل۔ ایل۔ بی یا اس کے مساوی

تعلیم حسب سابق شام کے اوقات میں ہوگی۔ ان شاء اللہ!

{ گزشتہ چار سالوں میں معہد عالی سے فارغ ہونے والے طلبہ کی کثیر تعداد مزید تعلیم کے لئے سعودی یونیورسٹیوں میں وظائف حاصل کر چکی ہے۔ }

●

مدیر المعہد العالی للشریعۃ والقضاء (انسٹی ٹیوٹ آف ہائر سٹڈیز ان شریعہ اینڈ جوڈیشری)

۹۹-J ماڈل ٹاؤن۔ لاہور (۱۴)، فون: ۸۵۲۸۹۷ / ۸۵۳۰۱۶

Regd. No. L. 7895 Phones : 852897 - 63210

Monthly MOHADDIS Lahore-14

ISLAMIC RESEARCH COUNCIL

★ عناد اور تعصب قوم کے لیے زہرِ ہلاہل کی حیثیت رکھتے ہیں ــــ لیکن تعصبات سے بالاتر رہ کر افہام و تفہیم اُمت کے لیے رحمت کا باعث ہے۔

★ علوم جدیدہ سے ناواقفیت اور انکار، انسانی اِرتقا کو تسلیم کرنے میں بخل کا درجہ رکھتے ہیں ــــ لیکن قدیم علوم اسلامیہ کو فرسودہ قرار دینا اور مذہبی روایات کے حاملین کو دقیانوس بتانا اُمت کی تباہی کا سبب ہے۔

★ غیر مذاہب کے بارے میں معاندانہ رویہ اختیار کرنا اسلامی اقدار کے منافی ہے ــــ لیکن دین اسلام پر غیر مذاہب کے حملوں کا دفاع نہ کرنا اور اسلام کی تبلیغ کا فریضہ سر انجام نہ دینا حمیّت دینی اور غیرتِ اسلامی سے یکسر انحراف ہے۔

★ تبلیغِ دین اور نشر و اشاعتِ اسلام میں حکمتِ عملی کو نظر انداز کر دینا مصالحِ دینیہ کے خلاف ہے، ــــ لیکن حرام و حلال کے امتیاز میں رواداری برتنا اور قوانین و مسائلِ اسلامیہ کو نرم کر دینا اسلامی رُوح کو کمزور کر دینے کے مترادف ہے۔

★ آئین و سیاست سے بیگانہ ہو کر عبادت کے لیے گوشہ نشین ہو جانا زندگی سے فرار ہے ــــ لیکن

ع جُدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

★ جاہل کو دور ہی سے سلام کر دینا عبادِ صالحین کے اوصاف میں داخل ہے ــــ لیکن جاہلیت کو مٹانا اور باطل کا تعاقب کرنا عین جہاد ہے۔

اگر آپ ایسا منصفانہ اور معتدلانہ رویہ پسند کرتے ہیں تو:

مُحدّث

کا مطالعہ فرمائیے۔ آپ اس کو ان جملہ صفات و محاسن سے مزیّن پائیں گے ان شاء اللہ۔ کیونکہ اس کے مضامین اسی مخصوص طرزِ فکر کے حامل ہوتے ہیں۔

زر سالانہ ۳۰ روپے

فی پرچہ ۳ روپے